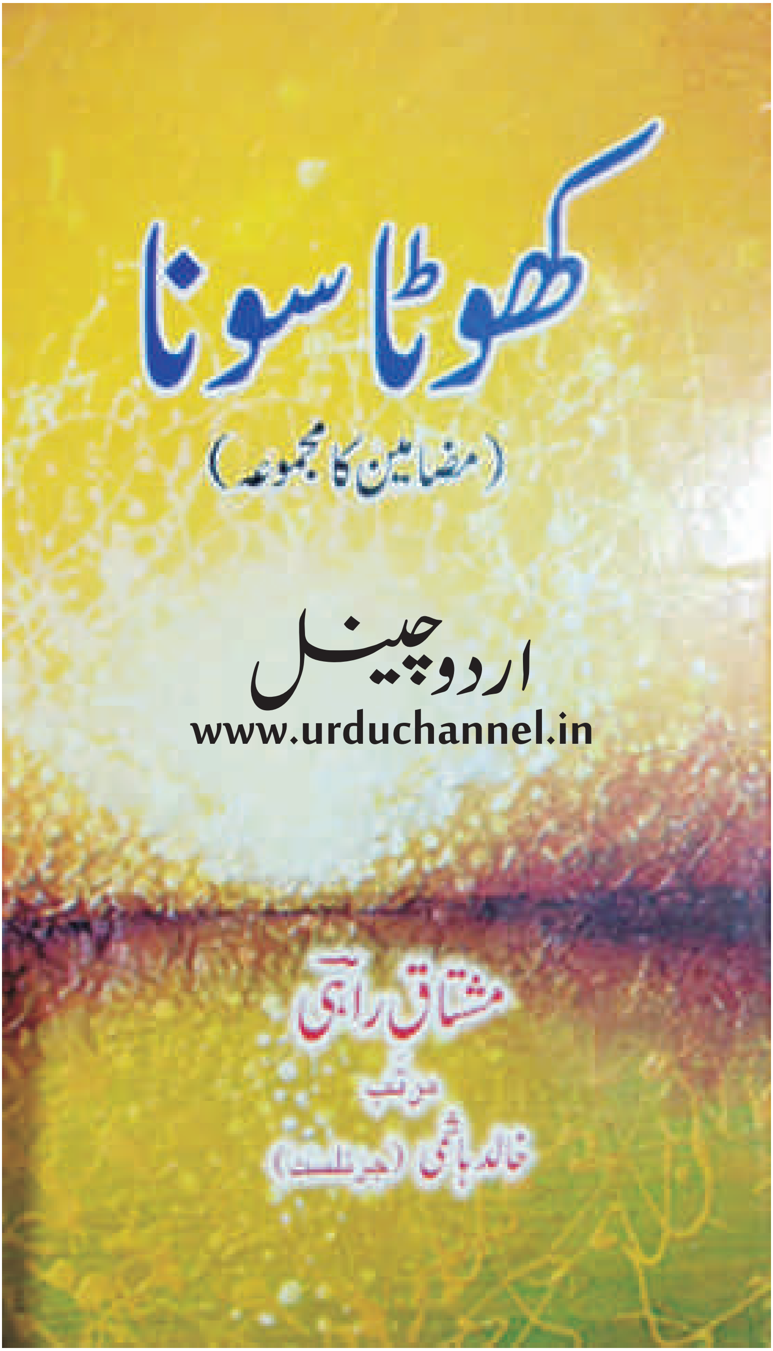

کھوٹا سونا

(مضامین کا مجموعہ)

اردو چینل

مشتاق راہی

مرتب
خالد ہاشمی ([illegible])

کھوٹا سونا

(مضامین کا مجموعہ)

کھوٹا سونا

(مضامین کا مجموعہ)

مشتاق راہی

مرتّب

خالد ہاشمی (جرنلسٹ)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ!

KHOTA SONA

(Mazamin Ka Majmua)

by

MUSHTAQUE RAHI

Edited by

Khalid Hashmi

C/o. Rahi P~~hone & Mobiles~~
Popri Bazar, Sitamarhi-843320
Mob: ~~09304154779~~ 94

Year of Edition 2010
ISBN 978-81-8223-620-2
Price Rs. 100/-

MOBILE NO. 9430239782 on
8210688187
Email khalidhashmi1967@gmail.com
watsAPPs 9430239782

نام کتاب : کھوٹا سونا (مضامین کا مجموعہ)
مصنف : مشتاق راہی
مرتب : خالد ہاشمی (جرنلسٹ)
سنِ اشاعت : ۲۰۱۰ء
قیمت : ۱۰۰ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔ ٦

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

پروفیسر اسلم آزاد

کے نام

جو

خلوص، خدمت اور خاکساری کے پیکرِ مجسم ہیں

☆☆

فہرست

☆ اپنی بات مشتاق راہی 9

1۔ آج پھر اتوار ہے 11

2۔ پلیٹ فارم 17

3۔ اگلا امیدوار 22

4۔ تصور عرش پر ہے اور.......... 27

5۔ چارہ گر 34

6۔ عافیت اندیش فنکار 43

7۔ مجھے امیدواروں سے بچاؤ 51

8۔ ایک پاؤں کا جوتا 58

9۔ ہمارا احترام کرو 64

10۔ جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا 70

11۔ ہم کیا جواب دیں 75

12۔ مانگے کا اجالا 82

13۔	کھوٹا سونا	86
14۔	رشکِ قمر دولہا	93
15۔	تن کے اُجلے من کے کالے	100
16۔	بیوقوفی زندہ باد	106
17۔	شہرت اور شاعری	112

☆☆

اپنی بات

اپنے بارے میں کچھ کہنا کہیں زیادہ مشکل اور دشوار ہے جتنا کہ آسان اور سہل ہے روئداد جہاں بیان کرنا۔ مجھے اپنے منہ میاں مٹھو بننا کسی قیمت پر پسند نہیں ہے۔ کسی کی خوبیوں کا سراہا جانا الگ بات ہے لیکن میں بیجا تعریف کا قائل نہیں ہوں کیونکہ تعریف سے تکبر کا جنم ہوتا ہے۔

کسی فنکار کی تخلیق ہی اس کی پہچان اور تعارف کا بہترین وسیلہ ہے اور اس کی پسندیدگی فنکار کی کاوشوں کا اجر وانعام ہوتی ہے۔ جس شئے کی پسند ناپسند کا انحصار دوسروں پر موقوف ہو، اس کے متعلق اپنی آراء سے متاثر کرنا مناسب نہیں۔ اس لئے میں کچھ کہوں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ میری تحریر خود ہم کلام ہو۔ لیجئے میرے مضامین کا مجموعہ 'کھوٹا سونا" آپ کے پیش نظر ہے۔

اپنے متعلق صرف اتنا بتادوں کہ بہار میں واقع مدھوبنی ضلع کے مشہور گاؤں پر سونی کے ایک متوسط، معزز اور مذہبی گھرانے میں 1944 ~~[illegible]~~ء میں میری پیدائش ہوئی، میرے والد حافظ عبدالجبار درس وتدریس سے وابستہ تھے۔ میرے والد نے ۱۹۵۳ء میں سیتامڑھی ضلع کے مشہور قصبہ پوپری میں تجارت شروع کی تو میں بھی ان کے ساتھ پوپری میں رہنے لگا اور اب پوپری ضلع سیتامڑھی میرا مستقل مسکن ہے۔

انجمن ترقی اردو بہار میں شامل ہو کر ۱۹۶۰ء میں اردو تحریک سے وابستہ ہوا۔

اور صحافت شروع کی۔ بہار کے مشہور روزنامے صدائے عام، ساتھی، سنگم صنم مسرت پٹنہ صبح نو اور قومی تنظیم میں میری تحریریں اشاعت پذیر ہوتی رہی ہیں۔

میری پہلی کہانی ایک دل بزار غم "صدائے عام" کے عید نمبر میں شائع ہوئی۔ پہلی کہانی کی اشاعت سے بے انتہا مسرت اور حوصلہ ملا۔ اس کے بعد سے اب تک قلم کی روانی اور جولانی قائم ہے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بھی متعدد افسانے نشر ہو چکے ہیں۔

میرا اور اردو کا رشتہ میری روح کا حصہ بن چکا ہے۔ اردو کا کعبہ میرا کعبہ ہے۔ اردو کا دوست میرا دوست ہے اور اردو کا دشمن میرا دشمن ہے۔ اردو کا مسئلہ میرا مسئلہ ہے ، اردو کا غم میرا غم ہے اور اردو کی ترقی میری روحانی خوشی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں سب سے پیاری شئے کون سی ہے تو میں بیساختہ کہوں گا۔ اردو! اردو! اردو!!!

"کھوٹا سونا" کی اشاعت میں جن کرم فرماؤں نے تعاون کیا ہے اور اوارے نے شائع کیا ہے ان کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی خاص طور سے اپنے کرم فرما پروفیسر اسلم آزاد کا شکرگزار ہوں جن کی مہربانی سے یہ کتاب اشاعت پذیر ہو سکی ہے۔ میں جناب ایس۔ ایم اشرف فرید اڈیٹر قومی تنظیم کا بھی احسان مند اور شکر گذار ہوں جن کی عنایت سے میرے مضامین اور مجھے لاکھوں اردو نوازوں سے متعارف ہونے کا موقع نصیب ہوا۔

وصال

06 aug 2017

مشتاق راہی

پوپری، سیتامڑھی، بہار

MOBILE NO. 9430239782

8210688187

Email khalidhashmi1967@gmail.com

watsAPPs 9430239782

آج پھر اتوار ہے

“معقول رشتے کی تلاش کتنا مشکل، دشوار اور صبر آزما کام ہے یہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ لڑکے والے اپنے سات پشتوں کا ارمان پورا کرنے کا منصوبہ لئے رہتے ہیں اور مہذب طریقے سے سب کچھ لوٹ کر بھی یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے لڑکی والوں پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ حرص و ہوس کے بندوں نے ستم کو بھی کرم کا روپ دے رکھا ہے۔”

وکیل صاحب سامنے بیٹھے ہوئے اپنے دوست وکیل صاحب سے ان حالات کا ذکر کر رہے تھے۔ اپنی بیٹی کے رشتے کے لئے انہیں جن مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ جس کے لئے وہ ہر اتوار کے دن کہیں نہ کہیں کا سفر کرتے رہے۔

وہ بھی اتوار کا دن تھا۔ اور وکیل صاحب حسب معمول تیار ہو کر مولوی کرامت کا انتظار کر رہے تھے۔ جو کار ثواب سمجھ کر دلوں کو جوڑنے کا کام بڑے خلوص سے کر دیا کرتے ہیں، مگر پہلے کی طرح وکیل صاحب کے چہرے پر فکر و پریشانی کے بجائے مسرت کی جھلک تیر رہی تھی اور لڑکے کی تلاش میں ہوئے ماضی کے تلخ تجربات اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔

میں نے مولوی صاحب کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا تھا کہ لڑکا تعلیم یافتہ، خوبصورت وجہت مند اور برسر روزگار ہو تو بہت بہتر ہے۔ مولوی صاحب دھن کے پکے ہیں۔ دوسرے دن نازل ہو کر فرمانے لگے۔ خوشی کی بات ہے کہ بہت معقول رشتہ مل گیا ہے، ہماری بیٹی زندگی بھر عیش کرے گی۔ یہ رشتہ آپ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ لڑکا کروڑ پتی تاجر ہے، صرف ڈگری ہولڈر نہیں ہے۔”

“مولوی صاحب نے اپنی بیٹی کو چاندی کے کھونٹے سے نہیں باندھ سکتا” میں

نے برہمی سے کہا۔ ''بیل کے سینگ میں سونا جڑ دینے سے وہ ہرن نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تعلیم میری پہلی ترجیح ہے۔ آپ میرے مخلص ہیں برا نہ مانیں اور دوسری خوبیوں کے ساتھ ایک تعلیم یافتہ لڑکا تلاش کر دیں۔''

وہ اتوار کا دن تھا۔ مولوی کرامت کی رہبری میں ہم لڑکا دیکھنے گئے تھے گھر کے باہر تو کوئی موجود نہیں تھا مگر مولوی کرامت کے پکارنے پر گھر سے ایک بوڑھا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے ہمیں سلام کر کے ننگی چوکی کو بوسیدہ بچھاون سے ڈھک کر بیٹھنے کی فرمائش کی اور کونے میں پڑی ہوئی خستہ حال کرسی گھسیٹ کر خود اس پر بیٹھنے کے بعد مولوی صاحب سے ''ہم کلام ہوا...... '' آپ لوگ بھٹک کر کیسے یہاں آئے ہیں۔''

''یہ شہر کے بہت اچھے وکیل صاحب ہیں'' مولوی کرامت علی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بتایا، ''یہ اپنی لڑکی کے رشتہ کے لئے غیر رسمی طور پر لڑکا دیکھنے آئے ہیں۔''

''سہراب بابو کا تو بڑے بڑے گھرانوں سے رشتہ آ رہا ہے۔'' سامنے دالان میں چند بے فکرے جوان تاش کے پتوں سے دل بہلا رہے تھے جن پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔ ''مگر جہاں مقدر میں لکھا ہو گا وہاں تو ہو ہی جائے گا۔''

''لڑکا بی اے کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا ہے یا کوئی دوسرا کام کرنے کا ارادہ ہے؟''

''تعلیم میں تو بہت وقت برباد ہو چکا ہے۔'' مولوی کرامت کے جواب میں وہ کہنے لگا۔ ''اس گاؤں میں کسی نے اتنی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اس عمر کے لڑکے گاؤں میں سیٹھ بن چکے ہیں۔ وہ کاریگری والا کام کرتے شرم محسوس کرتا ہے۔ اس لئے شادی کے بعد ریڈی میڈ کی دوکان کھولنے کا ارادہ ہے۔''

''شادی سے پہلے دکان کیوں نہیں کھول لیتے۔'' مولوی کرامت نے طنزیہ پوچھا۔

''کیا تلک کی بھاری رقم کا انتظار ہے۔''

''آپ کی مرضی چاہے جو سمجھیں۔''

"بہر کیف آپ کا کوئی مطالبہ ہے تو وکیل صاحب کو بتایئے۔"

"وکیل صاحب تو خود بڑے آدمی اور بڑے سمجھدار ہیں ان کو ہم کیا بتلائیں" پھر بھی اس نے مزے لے لے کر بتانا شروع کیا۔ اس دن ایک جگہ سے بڑے لوگ آئے تھے۔ وہ خود ایک لاکھ روپیہ نقد، موٹر سائیکل، پانچ سوٹ کا کپڑا اور دوسرے قیمتی سامانوں کے دینے کی بات کہہ کر گئے ہیں۔ ابھی ان کو کوئی جواب نہیں دیا ہے، آپ بھی اپنا خیال ظاہر کریں تو غور کر کے خبر کر دیں گے۔" میرے دوست میں نے زندگی میں جانے کتنے مقدمات میں مباحثے کئے ہوں گے۔ مخالفین کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر قائل کیا ہوگا۔ مگر اس نا معقول کی اوقات سے بڑی بات سن کر میری ساری قابلیت جواب دے گئی۔ عقل سلب اور زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ میں واپسی کے لئے کھڑا ہو گیا، میں نے یہ بھی نہیں سنا کہ مولوی کرامت نے اس سے کیا کہا تھا۔

"دوسرے سفر کا دلچسپ ماجرا میں سناتا ہوں۔" مولوی کرامت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں بولے اور خود ہی چائے کا حکم صادر فرماتے ہوئے سامنے بیٹھ کر گویا ہوئے۔

قصہ مختصر یہ کہ ایک اتوار کے دن طویل سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچے، ناشتہ کے بعد بلا تمہید مطلب کی بات شروع کی۔ "آپ کے جاوید بابو گھر پر ہی ہوں گے۔"

"وہ آفس گئے ہیں۔" لڑکے کے باپ نے بتایا۔ "شام تک گھر آ جائیں گے۔"

کیا سرکاری ملازم ہیں۔" وکیل صاحب خوش ہو کر پوچھ بیٹھے۔

"نہیں وہ علاقہ کے لوگوں کا سرکاری کام کرانے بلاک جاتے ہیں۔" لڑکے کے باپ نے وضاحت سے بتایا۔

"دیکھئے نا لوگ ہر وقت گھیرے ہوئے رہتے ہیں۔ بہت پریشان کرتے ہیں۔ جاوید بابو ہر وقت لوگوں کے کام میں ہی مصروف رہتے ہیں۔"

"کیا انہیں اپنا کوئی کام نہیں ہے۔"

"دوسروں کے کاموں میں اپنا بھی کام نکل جاتا ہے۔"

ہم لوگ جاوید بابو کے رشتے کی بات کرنے آئے ہیں۔ میں نے گفتگو کو مقصد کی طرف لاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ کا کوئی مطالبہ ہو تو بتائیے۔"

"میرا تو کوئی مطالبہ نہیں ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بتانے لگا۔ لڑکی والے تو خود ہی بڑھ چڑھ کر دینے کو تیار ہیں، ایک صاحب عرب میں رہتے ہیں وہ بھاری رقم کے علاوہ موٹر سائیکل بھی دینے کی بات کہہ گئے ہیں، اس کے علاوہ اپنے خرچ پر عرب لے جانا چاہتے ہیں۔ جاوید بابو تو تیار نہیں ہیں اس لئے کہ وہ مکھیا کے چناؤ کی تیاری کر رہے ہیں۔ بہر حال آپ لوگ بھی اپنا خیال ظاہر کیجئے تو مشورہ کر کے خبر کر دیں گے۔"

بس اس سے آگے کچھ سننا وکیل صاحب کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس کی باتیں ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کے چہرے سے دلی کیفیات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اگرچہ بھوک ستا رہی تھی اور وہ بجھانے کی ضد بھی کر رہا تھا۔ مگر ان کے تیور کی وجہ سے جگہ کو جلد خیر باد کہنے میں ہی عافیت تھی محض چند قدم چلنے کے بعد ہی وکیل صاحب کا غصہ برداشت کی حدوں سے نکل پڑا۔ "ایسے حرامزادوں کو برباد کر دوں گا، جیل میں چکی پسوا کر چھوڑوں گا...... دیکھتے ہیں مردود کا بچہ کیسے مکھیا بن جاتا ہے۔"...... وغیرہ وغیرہ...... اس دن ان کو سنبھالنا آسان نہ تھا کئی جانوروں سے بھی اس کا شجرہ ملاتے رہے تھے۔ جو حرام ہیں۔

"صاحبان ڈوبنے والے کی کیفیت کو ساحل کے تماشائی کیا جانیں" وکیل صاحب گفتگو پر قبضہ جماتے ہوئے کہنے لگے۔

"بہتر ہوگا کہ میری روئداد غم میری زبانی سنئے۔"

قصہ کوتاہ ایک اتوار کے دن ہم دونوں آدمی پھر ایک دالان کے کشادہ آنگن میں کھڑے تھے۔ جس کے اطراف میں مختلف قسم کے پیڑ پودے بے ترتیبی سے لگے ہوئے تھے، ایک کینا ورانڈے میں بے فکر لیٹی تھی، چند مرغیاں ادھر ادھر اپنی مرضی سے بھٹک رہی تھیں۔ کسی آدم زاد کا پتہ تھا اور نہ کوئی آدمی آس پاس دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں تیر چلانے کی طرح مولوی کرامت کے پکارنے پر ایک جوان لڑکے نے لڑکیوں کی طرح

جھانک کر یوں دیکھا جس طرح کچھوا آدمی کو دیکھ کر خول میں سما جاتا ہے۔ لڑکے نے ہمیں دیکھتے ہی گردن موڑی اور دروازہ پھر بند کر لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر لڑکے کی حرکت کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں ناکام رہے اور دروازے پر اس طرح نگاہ جمائے کھڑے رہے جیسے اس بار کوئی نمودار ہوا تو اسے جانے نہیں دیں گے۔ بہر کیف خدا خدا کر کے دوسری بار لڑکے کا باپ خود ہی دروازہ سے برآمد ہوا اور خوشی کی بات تھی کہ شربت کے ساتھ آیا تھا۔ شاید ہم جیسوں کی آمد کے لئے اس نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ ہم نے شربت سے گلا تر کیا اور مولوی کرامت بلا تکلف کام کی باتیں کرنے لگے۔

”آپ اپنے لڑکے کے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔“

”شادی کے بعد عرب جانے کا ارادہ ہے“ لڑکے کا باپ بتانے لگا۔ کل ہی رشتہ کے لئے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ دیگر سامانوں کے علاوہ عرب جانے کا خرچ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن لڑکے نے موٹر سائیکل کی فرمائش کر دی ہے۔ جس کے لئے وہ گھر والوں سے مشورہ کر کے خبر کر دیں گے اب آپ لوگ بتائیں کہ کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔“

اس نامعقول کو کیا بتاتے کہ ہم کس غرض کے مارے بھٹک رہے ہیں۔ ہم واپسی کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس گوشۂ جہنم سے، بہت جلد دور ہو جائیں۔ جہاں اس بوڑھے بیٹے والے کے سات پشتوں کی روحیں اپنی حسرتوں کا جنازہ اٹھائے بیٹی والوں کا جنازہ نکالنے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔

”بے شک...... بے شک“ مولوی کرامت نے تائید کرتے ہوئے یاد دہانی کرائی
”آج پھر اتوار ہے۔“

”مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے اور میں پابہ رکاب ہوں مگر آج معاملہ برعکس ہے۔“ وکیل صاحب خلاف معمول خوشی سے پھڑک رہے تھے۔ مولوی کرامت کے چہرے سے حیرت کی دھند ہٹانے کے لئے وضاحت سے بتانے لگے۔

مولوی صاحب اب تک آپ زحمت کر کے مجھے در بدر گھماتے رہے ہیں۔ دراصل ہم دانشمندوں کو دور تک تو نظر آتا ہے۔ مگر اپنے قریب دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ کتنی

پریشانیوں اور ذلتوں کے بعد مجھے خیال آیا کہ کسی ایرے غیرے کو بھاری رقم دے کر اپنی بچی حوالے کردوں گا۔ اس سے کہیں بہتر یہ نہیں ہوگا کہ اپنے تعلیم یافتہ، خوبصورت اور خاندانی بھانجے سے رخشندہ کا نکاح کردوں۔ اور اسی رقم سے کوئی معقول تجارت کرا کے بھانجے کی بیکاری بھی دور کردوں۔ لہٰذا آج آپ کو اپنی بہن کے گھر لے جا رہا ہوں۔ ایک تیر سے دو شکار آپ کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے تو بہتر ہے۔“

”تو گویا کہ......گویا کہ......“ مولوی کرامت ہکلائے۔ ”آخر آپ۔“

”ہاں مولوی صاحب آخر لوٹ کے بدھو گھر آ گئے۔“ وکیل صاحب نے بے انتہا مسرتوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور پورا کمرہ فلک شگاف قہقہوں سے اس طرح گونج اٹھا کہ زنانخانے سے خواتین بھی چلی آئیں اور کمرے کا پردہ سرکا کر جھانکتے ہوئے حقیقت جانے بغیر مسکرانے لگیں!

☆☆

پلیٹ فارم

ٹرین حسب معمول لیٹ تھی۔ پلیٹ فارم پر بوریت زدہ ماحول اونگھ رہا تھا اور مسافر عادت کے مطابق ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ چاہے ریل گاڑی اپنی مرضی سے جب آئے وہ انتظار کرتے رہیں گے۔ کچھ مستقل مسافر کرایہ کے پیسوں سے ناشتہ، چائے اور پان کھا کر اسٹیشن ایریا میں اس طرح چہل قدمی کر رہے تھے جیسے ریلوے کے مہمان ہوں اور سسرال آئے ہوئے ہوں۔ اگرچہ بسوں کے ذریعہ بھی وہ اپنی منزلوں پر پہنچ سکتے تھے مگر سرکاری سواری پر مفت سفر کرنے کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ویسے مسافروں کو گھر جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہاں کون سی خوشیوں کی برات ان کا سواگت کرنے کے لئے بے تابی سے منتظر تھی؟ بلکہ وہاں بھی بے لطف زندگی، ماحول میں یکسانیت اور بوریت روزانہ کی طرح راستہ دیکھ رہی تھی۔ اچھا تھا کہ ٹرین لیٹ تھی اور وقت کٹ رہا تھا...... بیت رہا تھا...... گذر رہا تھا!

ہمارے یہاں جن چیزوں کی قدرت نے فراوانی عطا کی ہے ان میں سے ایک وقت بھی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے سفر میں اگر پورا دن بھی لگ جائے تو شکایت اور افسوس کرنے کے بجائے لوگ سمجھتے ہیں کہ بوجھل زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ جن لوگوں کے وقت کی اہمیت ہے وہ قیمتی کاروں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں یہ کچھ لوگ ہیں جو زندگی گذارتے ہیں۔ مگر بیشتر لوگ لوکل ریل میں سفر کرتے ہیں اور دکھ بھری زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ جمہوریت میں کثرت کی اہمیت ہے مگر ان کے سکھ دکھ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جیسے جنگل کی لکڑیاں ہوں، محلوں کی زینت بڑھانے کے لئے۔

بہر کیف ایک منتری نے عوام کی عادتوں اور وقت کی آزادی کا خیال کئے بغیر صرف

ریل گاڑی کو وقت کا پابند کر دیا تھا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے اس زمانے میں بیشتر مسافروں کی ٹرین چھوٹ جایا کرتی تھی۔ بڑی مشکلات کے دن آ گئے تھے۔ خستہ حال سڑکوں پر بس میں جان کی بازی لگا کر سفر کرنا پڑتا تھا۔ بے مرمت سڑکوں پر چیچک زدہ چہروں کی طرح گڈھے پڑ گئے تھے۔ اسے سڑک کی بجائے موت کا کنواں کہنا زیادہ بہتر ہوگا جس پر سفر کرتے ہوئے ہر لمحہ بس کے الٹ جانے کا خطرہ محسوس ہوتا تھا اور مسافروں کو لگتا تھا جیسے بس کی بجائے ہاتھی پر بیٹھ کر سفر کر رہے ہوں۔ دانشمندوں کا قول ہے کہ حکومت کاغذ پر چلتی ہے۔ لیکن جن سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کے کام بھی کاغذ پر ہی ہوتے ہوں تو بے چاری سڑکوں کا حال کیا ہوگا؟ کتنا اچھا ہوتا اگر بسوں کو بھی کاغذ پر چلانے کی کوئی ترکیب نکالی جاتی۔ بہر حال بسوں میں ہچکولے کھاتے ہوئے ریل گاڑی پر بغیر کرایہ ادا کئے آرام دہ سفر کرنے والے مسافر ریل منتری کو گالیوں سے نوازتے ہوئے سب اس بات پر متفق تھے کہ منتری جی کی شکل بھارتی اور عقل ولایتی ہے۔

اس بار ریل منتری کو عوامی زندگی کا ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے اس نے عوام کی عادت اور فراغت اوقات کی مطابقت سے ریل گاڑی کو وقت کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے، کوئی مسافر خود بور ہو کر واپس لوٹ جائے تو الگ بات ہے مگر کسی مسافر کو اب ٹرین نہیں چھوڑتی ہے، آزاد عوام کے لئے ٹرین کو بھی وقت کی پابندی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اب لوگ کہتے ہیں نیا منتری انگریز کی طرح صرف اپنے مفاد کی فکر میں رہتا ہے، ہم ہندوستانی چاہے جہنم میں چلے جائیں اسے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

کسی بھی معاملہ پر رائے زنی کرنا ہمارا پیدائشی حق ہے، آزادی کا ایک ہی فائدہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو دل میں آئے برملا کہہ دیجئے کوئی گرفت نہیں ہے، صرف اقلیتوں کے لئے پیمانہ الگ ہے۔ بس تھوڑا سا فرق ہے جو فرق مالک اور ماتحت میں ہوتا ہے لیڈر اور پبلک میں ہوتا ہے، عوام اور حکومت میں ہوتا ہے!

بہر کیف بات ریل گاڑی کی ہے، جب ریل گاڑی وقت کی پابندی سے چلنے لگی تب بھی لوگ ناراضگی ظاہر کرتے تھے اور اب لاپرواہی کے باعث من موجی طریقے سے

چل رہی ہے پھر بھی لوگ شکایت کا اظہار کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شکایت کرنا بھی وقت گزارنے اور دل بہلانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو رہا ہے شکایت کرنا اب کوئی گناہ اور پاپ نہیں ہے، اب تو سیاست کی منڈی کا سارا کاروبار، سنگار اور دارومدار شکایت ہی کے دم قدم سے قائم ہے میڈیا کی زندگی اور زینت شکایتوں کی مرہون منت ہیں۔ صرف نفرت اور دشمنی کی وجہ سے شکایت نہیں کی جاتی اگر ایسا ہی ہوتا تو جس حکومت، منسٹر اور لیڈر کی شکایت کرتے ہوئے لوگ تھکتے نہیں ہیں، لیکن وقت آنے پر پھر بھی اسی کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟ دراصل شکایت اس دور میں بے حد کارآمد حربہ ثابت ہو رہا ہے اور بہت کم لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ شکایت، الزام تراشی، فریب، بے شرمی اور بے ایمانی کا عالمی سطح پر سیاسی کرن ہو چکا ہے۔

ٹرین کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا، بات کرنے کے لئے کوئی بات بھی نہیں رہ گئی تھی، ہر موضوع پر مباحثے ہو چکے تھے، شدت سے بوریت کا احساس ستانے لگا تھا، اچانک نیتا جی کا پلیٹ فارم پر آتے دیکھ کر مایوس چہروں پر رونق سی آ گئی، ایک نوجوان نے دور سے ہی بلند آواز میں پرنام کہا اور سب لوگوں نے اس کی حمایت میں اس طرح ایک ساتھ پرنام کیا جیسے انقلاب زندہ باد کہا جاتا ہے۔

نیتا جی جان کر بھی انجان بنتے ہوئے بھرپوری مسکراہٹوں سے سلام کا جواب دیتے ہوئے بنچ پر بیٹھے اور پوچھا "ٹرین کا کیا حال ہے بھائی۔"

"جتنا کس حال میں ہے اس سے نیتا جی کو مطلب نہیں مگر اپنے لئے ٹرین کا حال پہلے پوچھ رہے ہیں" ایک باتونی نے بات بنائی "اے مہاراج آپ آ گئے تو اب ٹرین بھی آ جائے گی۔"

"اچھا اچھا تم لوگ اپنے ہی حال چال بتاؤ۔"

"سیتامڑھی ضلع کی سڑکیں کب تک موت کا کنواں بنی رہیں گی؟"

جس نکمے، نا اہل اور ناکارہ کو ودھائک بنایا ہے اس سے کیوں نہیں پوچھتے؟ انہیں تو انتخاب میں خرچ ہوئی لاگت کو منافع کے ساتھ حاصل کرنے اور آئندہ

چناؤ کے لئے رقم جمع کرنے سے فرصت کہاں ہے جو عوام کی ضروریات پر توجہ دے سکے۔

"آپ لوگوں نے گمبھیر معاملہ چھیڑ کر نیتا جی کا موڈ خراب کر دیا" ایک نوجوان نے موضوع کا رخ پھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہمارے نیتا جی جیسے ایماندار آدمی کامیاب ہوتے تو چھیتر کی حالت کچھ اور ہوتی مگر افسوس کہ تین بار سے لگاتار ہارتے آرہے ہیں۔"

"یہ ہار جاتے ہیں اسی لئے تو لوگ اپنا ووٹ برباد کرنا نہیں چاہتے۔"

باتوں کا سلسلہ چل پڑا سب اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔

"اصل میں نیتا جی ریل کے بدلے پلیٹ فارم کا ٹکٹ لیتے ہیں۔"

"لیکن ان کے جیسے آدمی کو کامیاب ہونا چاہئے۔"

"اگر ایک بار کامیاب ہوگئے تو چھیتر کا سارا کام ہو جائے گا۔"

ہمارے یہاں ایمانداری کی کوئی قدر کرنے والا نہیں ہے۔

ایک زمانہ آئے گا جب ایمانداری کے لئے نیتا جی جیسے لوگوں کی تلاش ہوگی۔"

"جب وہ زمانہ آئے گا نیتا جی ایمانداری کے ساتھ پرلوک سدھار جائیں گے؟

سب لوگ اظہار خیال کی آزادی کا حق ادا کر رہے تھے، اور نیتا جی بڑے دھیرج کے ساتھ ان کی باتوں کو سنتے ہوئے موقع کی تاک میں تھے، جیسے ہی کسی نے اپنا جملہ پورا کیا تو وہ بولے۔ "تم لوگوں کے منہ سے ایمانداری کا چرچا سن کر من کو شانتی ملی۔ چلو ایمانداری نہیں ہے مگر اس کا نام تو زندہ ہے۔"

"کیسی بات کرتے ہو نیتا جی" چٹ سے ایک آدمی کہنے لگا۔ "ایمانداری کہاں ہے مگر اس کا روپ بدل گیا ہے۔ کام نکالنے کے لئے ایمانداری شبد کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلے اس کو آتما میں سنجوگ کر رکھے تھے۔ اب کام نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ جیسے اس پلیٹ فارم کا استعمال کر کے تھوک کر ہم چل دیں گے۔"

"تم لوگ بیٹھو میں دس منٹ میں آیا۔"

نیتا جی دس منٹ کی فرصت میں گئے تو ایک اجنبی نے تعریفی نگاہوں سے انھیں

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسے ایماندار لوگ ابھی باقی ہیں۔“

”اس دیس میں سائن بورڈ پر وشواس کیجئے گا تو مارے جایئے گا بھائی جی۔“

نیتا جی کے گاؤں کا ایک آدمی بتانے لگا۔ ”ان کا ایک لڑکا ٹھیکیداری کرتا ہے۔“

آج کل ٹھیکیداری میں کیسی لوٹ مچی ہے سب جانتے ہیں۔ دوسرا بیٹا شراب کی دکان چلاتا ہے۔ صرف لیبل باہر کا ہوتا ہے مال گھر کا ہوتا ہے۔ جب کہ تیسرا لڑکا ڈیلری کرتا ہے۔ کوٹہ کا سامان بیچ کر بھی سینہ تان کر گھومتا ہے۔ کوئی ٹوکنے کی ہمت بھی نہیں کرتا کیونکہ نیتا جی کا بیٹا ہے۔ سب کام نیتا جی کی جانکاری اور سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کو بے ایمانی کا موقع نہیں ملا ہے وہ ایمانداری کا راگ الاپ رہا ہے۔“

ٹرین کی آمد کے اعلان کے ساتھ نیتا جی سوچالیہ سے باہر آئے۔ قریب آتے ہی ایک جوان نے پھر انھیں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ ”ایمانداری کے کارن ہی نیتا جی لوک پریہ اور پرسدھ ہیں۔“

”جو کامیاب ہو جاتا ہے وہ بھرسٹ ہو جاتا ہے۔“

”نیتا جی کی ایمانداری کی رکشا کرنا بہت ضروری ہے۔“

”نیتا جی کی ایمانداری کو بچانا ہے۔“ ٹرین کو دیکھتے ہی ایک جوان نے نعرہ بلند کیا اور سب نے زوردار آواز میں ایک ساتھ کہا۔ ان کو بار بار ہراتا ہے۔“

ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی۔ جس کے شور نے نعروں کے لئے سنگیت کا کام کیا۔ سب لوگ نیتا جی کی قیادت میں قہقہہ لگاتے ہوئے بنا ٹکٹ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ پکڑے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایسے مشہور اور تین بار ہارے ہوئے ایماندار نیتا پر ہاتھ ڈالنے کی کس میں جرأت تھی۔ اگر ان کو بھول سے بھی کوئی ٹوکتا تو ریلوے کی املاک بھسم کر دی جاتی۔

ٹرین جا چکی تھی اور بے چارہ پلیٹ فارم ...... اجڑا، اجڑا۔ سونا، سونا ...... خالی، خالی ...... بے کسی سے پھر کسی دوسری ٹرین کے انتظار میں بھی اونگھنے لگا جیسے انتخاب کے بعد عوام ...... بہت کچھ پانے کی امید میں سب کچھ کھو دینے کا احساس ...... بے کسی اور پچھتاوا ...... اور پھر دوسرے انتخاب کے منتظر ...... غلطیوں کی تلافی کے منصوبے بناتے ہوئے ......؟

☆☆

اگلا امیدوار

حیدر خان اور گلزار رائے کے جوڑے کو خدا سلامت رکھے۔ انھیں دیکھ کر دلوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔ دونوں نے سارا کام دھندہ تیاگ کر اپنی زندگی عوام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اپنے سکھ دکھ کا بھی انھیں ذرا خیال نہیں رہتا ہے۔ ہر وقت وہ دوسروں کے کام کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ اپنی باتوں کی دلکشی، کام کی لگن اور عوام کی خدمت کے جذبوں سے سرشار رہنے کی وجہ سے دونوں نے لوگوں کا دل موہ لیا ہے۔ وہ مایوس دلوں کی امید اور سہارا ہیں۔ لوگوں کو یقین ہے کہ وہ گاؤں کی ترقی اور لوگوں کا بیڑا پار لگائیں گے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ان کے کام کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حیدر خاں گلزار رائے کے دالان میں چلے آتے ہیں اور اسی وقت سے حاجت مندوں کی آمد بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ضعیفی پنشن، غریبی ریکھا میں نام درج کرانے، لال کارڈ بنوانے، بینک سے قرض حاصل کرنے، اندرا آواس بنوانے، ہینڈ پائپ لگوانے اور سرکاری زمین بندوبست کرانے جیسے مختلف کاموں کے لئے غرض مند سویرے آ جاتے ہیں۔ سرکاری کاموں کے لئے عوام کی سہولیت کے خیال سے مناسب قیمت پر فارم مہیا کرایا جاتا ہے۔ ان کی خانہ پری کے لئے گلزار رائے کا منجھلا بیٹا مقرر ہے وہ رضا کارانہ طور پر محض دس روپیہ فی کس لے کر اتنے اہم کام انجام دیتا ہے۔

گلزار رائے اشنان دھیان اور حیدر خان غسل سے فارغ ہو کر شفاف لباس زیب تن کر کے آ جاتے ہیں تب تک گلزار رائے کا لڑکا اپنا کام نپٹا چکا ہوتا ہے۔ وہ دونوں لوگوں کو بھی سناتے ہوئے بلند آواز میں سرکاری کاموں کے بارے میں آفس خرچ کے متعلق صلاح و مشورہ کرتے ہیں۔ پھر لوگوں کی حیثیت اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے آفس خرچ جمع ہو جانے کے بعد گلزار رائے سنجیدگی سے بتاتے ہیں۔ ہم لوگ تو آپ کا کام پوری

ایمانداری محنت اور کوشش سے کرائیں گے۔ یہ تو ہمارا دھرم اور ڈیوٹی ہے۔ لیکن ہمارے بس میں تو کچھ نہیں ہے۔ کسی کام کا ہونا اور نہ ہونا تو کرمچاری اور افسر کی مرضی پر زبرکرتا ہے۔ سب کام ہوہی جائے گا اس کی بھی گارنٹی نہیں ہے اور نہ اس کے لئے کوئی وقت مقرر ہے اس لئے کوئی کام افسر کی مجبوری اور کارنوں سے نہیں ہوسکا تو کوئی بھائی شکایت نہیں کریں گے اور بار بار تقاضا بھی نہیں کریں گے جو بھائی کسی اور سے کام کرانا چاہیں اپنا کاغذ خوشی سے لے جاسکتے ہیں۔ ''ہم سب کو آپ دونوں پر پورا وشواس ہے۔'' سب اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں ہمارا کام کروادیں۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ سب کو رخصت کرکے وہ گاؤں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ لیکن فریقین کی حیثیت کے مطابق کئی بیٹھک بھی ہوا کرتی ہے۔ جس میں داماد کی طرح خاطر تواضع سے بڑھ کر اہتمام رہتا ہے۔ وہ ناشتہ میں ہی دن بھر کے لئے فارغ ہوکر عوام کے کاموں کی غرض سے سرکاری آفسوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اپنے گھر کا کھانا شاید ہی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ دوسروں کی خاطر اپنے گھروں کا منہ بھی نہیں دیکھ پاتے۔ ان کی بیویاں اور بچے صورت دیکھنے اور دو میٹھے بول سننے کو ترستے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عوام کی خدمت سے بڑھ کر دنیا میں دوسرا کوئی مصروف ترین کام نہیں ہے اور یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کا مذاق اڑانے والوں سے بڑھ کر کوئی احمق بھی نہ ہوگا!

ان کی خدمت سے بڑھ کر دنیا میں دوسرا کوئی مصروف ترین کام نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی رہیں عوام کی خدمت کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی معاملہ فہمی، حاضر دماغی اور کسی بھی معاملے کا حال منٹوں میں نکال دینے کی فطری صلاحیت کا لوہا سب مانتے ہیں۔ اس دن کی بات لے لیجئے۔ معاملہ انتہائی خطرناک تھا۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ وہ دونوں وہاں موجود تھے ورنہ جانے کیا سے کیا نہ ہوجاتا۔ دونوں نے بہت اہم اور قابل تعریف کارنامہ انجام دیا تھا۔ خدا بھلا کرے حیدر خاں اور گلزار رائے کے جوڑے کا۔ لوگ ان کے اس احسان کو عرصہ دراز تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔ وہ بھولنے والی بات بھی نہیں ہے۔ اس کا چرچا زبان زدعام ہوچکا ہے۔

چشم دید لوگ لفظ بہ لفظ حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان اپنے بیل میلے میں فروخت کرنے لے جارہے تھے۔ سڑک پر اس قدر بھیڑ تھی کہ آدمی کا گزرنا بہت دشوار تھا۔ اچانک شور برپا ہوا اور جو لوگ جہاں پر تھے وہیں ٹھہر گئے۔ ساری بھیڑ دریا کے پانوں کی طرح دو حصوں میں بٹ گئی۔ درمیان میں دوسرے فرقے کے گوالے کا دودھ زمین پر گر پڑا تھا۔ معاملہ نہایت سنگین تھا۔ دودھ کی جگہ خون بہہ جانے کا اندیشہ یقینی تھا۔ ماحول خوفزدہ اور سراسیمہ ہو گیا تھا لیکن جیسے بجلی کوندتی ہے وہ دونوں جائے وقوع پر پہنچ گئے اور گوالے کا نقصان خود پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کرکے ڈر سے تھر تھر کانپتے ہوئے کسان کو آزادی دلادی۔ یہ تھا ان کا کارنامہ جس کے لئے وہ ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

وہ گوالا بھی ان کو زندگی بھر بھلا نہیں پائے گا۔ کسان تو چلا گیا اور وہ گوالے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اس کا معاوضہ بھی ادا کرنا تھا۔ اپنی جگہوں پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد گلزار رائے نے گوالے سے کہا۔ ’’سامنے کے ہوٹل سے دو چائے اور دو سگریٹ لیتے آؤ۔‘‘ گوالا چائے اور سگریٹ لے آیا۔ چائے کی چسکی لگانے کے بعد وہ فکرمند انداز میں سگریٹ کا کش یوں لے رہے تھے جیسے اتنے اہم معاملے کا حل تلاش کررہے ہیں اور گوالا کھڑا ہوا اپنے معاوضہ کے لئے ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ تقریباً آدھا سگریٹ کا دھواں ہضم کرنے کے بعد گلزار رائے نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’ایمانداری سے بتاؤ کہ تمہارا کتنا دودھ نقصان ہوا ہے؟‘‘

’’ایک لیٹر سے ادھک دودھ برباد ہوا ہے اور چائے سگریٹ پر بھی چار روپیہ خرچ ہوگیا ہے‘‘ گھاٹا پورا کرنے کی ترکیب بتاتے ہوئے گلزار رائے نے کہا۔ ’’وہ دیکھو سامنے مندر کے آنگن میں ہینڈ پائپ لگا ہے۔ وہاں سناٹا بھی ہے۔ تمہارا جتنا نقصان ہوا ہے دودھ میں اور پانی ملا کر اپنا گھاٹا پورا کرلو۔ بہت اچھی اور آسان ترکیب تم کو بتادیا ہے۔‘‘

گوالے نے ایک پل بھر ان کی مسکراتی ہوئی صورت کی طرف دیکھا اور اپنا دودھ کا برتن اٹھ کر بے بسی سے مندر کی طرف چلا گیا۔ جیسے بھگوان سے ان کی شکایت کرنے جارہا ہو۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ ان دونوں نے پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ گوالے نے اپنے نقصان سے زیادہ پانی دودھ میں ملالیا کہ گھاٹے کے مطابق ہی ایمانداری سے دودھ

میں پانی ملایا۔ یہ وہ جانے اور اس کا دھرم جانے!

حیدر خاں اور گلزار رائے کا جوڑ بے مثال ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جھگڑوں اور لفڑوں کی انہیں بو لگتی ہے۔ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں انہیں کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ آدھمکتے ہیں اور فریقین کو اپنی ثالثی ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا دخل انداز ہونا فال نیک بھی ثابت ہوتا ہے۔ جیسے اس دن وہ دونوں موقع پر بروقت نہیں پہنچ جاتے تو خون خرابہ ہو سکتا تھا۔

کھاد کے دکان دار موہن سنگھ اور ایک کسان کے درمیان بقایا کے معاملے پر گھماسان ہو رہا تھا۔ موہن سنگھ کسان کی گردن میں کپڑا لگا کر دکان کی طرف زبردستی کھینچے جا رہا تھا اور کسان ادھر نہ جانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ سکتی تھی۔ سیکڑوں افراد تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کے قریب جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ لیکن وہ دونوں وہاں آتے ہی بے خطر مجمع میں کود پڑے۔ اور دونوں فریق کو جدا کر کے سارا معاملہ اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ موہن سنگھ کا کسان پر دو ہزار روپیہ باقی تھا اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بات اتنی تھی کہ موہن سنگھ کو عزت کے ساتھ تقاضا کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے توہین آمیز طریقے سے تقاضا کیا تھا۔ دوسری طرف کسان ایک سال سے رقم رکھے ہوا تھا اور تقاضا کرنے پر وہی رعب بھی دکھایا کرتا تھا۔ بس اسے سبق سکھانے کے لئے موہن سنگھ نے کاروائی کی تھی۔

''تم لوگ اس وقت خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ سارا معاملہ ہماری سمجھ میں آگیا ہے، گلزار رائے نے ان سے کہا'' کسی دن وقت مقرر کر کے اور آپس میں بیٹھ کر سب معاملے طے کرلیں گے۔ لڑائی سے بات بگڑتی ہے اور بربادی ہوتی ہے۔'' جس نے ان کی تجویز سنا وہ تعریف کرتا چلا گیا۔ موجودہ سماج میں وہ بیسمت لوگ ہیں۔

معاملات کو سمجھنے، ان پر اصلاح و مشورہ کرنے اور پنچایت کے لئے وقت مقرر کرنے کے لئے دن کا کام ختم کر کے دونوں شام کے بعد کبھی موہن سنگھ کی دکان اور کبھی کسان کے دالان میں بیٹھک کرنے لگے۔ اگرچہ بات تو معمولی تھی لیکن دونوں فریق مالدار آسامی تھے اس لئے ان کی حیثیتوں کے اعتبار سے معاملہ اہم بن گیا۔ چونکہ صرف رقم

کی بات نہ تھی بلکہ عزت کا نازک سوال بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن ہر شام ناشتہ کا اہتمام اور سادے پانی میں رنگین پانی کی آمیزش کے باعث ان کی بیٹھک نا قابل برداشت حد تک پہنچ رہی تھی اور بیٹھک کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اتوار کی شام سج دھج کے حیدر خاں اور گلزار رائے ذرا سویرے موہن سنگھ کی دکان پر پہنچے تو وہاں خلاف توقع کسان کو موجود دیکھ کر حیران رہ گئے اور انہیں دیکھتے ہی وہ دونوں اپنی کرسیوں سے اٹھ کر ان کا والہانہ استقبال کرنے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے خوشی سے بولے۔

"ہم نے اپنا قرض بھائی جی کو معاف کر دیا ہے۔"

"ہم نے آپس میں صلح کر لیا ہے۔ اب ہم بھائی بھائی ہیں۔"

"حرامزادوں نے آج کی شام کا مزہ کر کرا کر دیا" واپس لوٹتے ہوئے حیدر خاں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"سالا بہت چالاک نکلا اور ہمیں خوب چکما دے دیا۔"

"انہیں چالاک کہنا تو بہت چھوٹی سی بات ہے، حیدر بھائی، وہ ہمارا استاد ثابت ہوا ہے" گلزار رائے نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"جب ہم اس دھندے میں ہیں تو بیٹا کبھی تو حال میں پھنسے گا۔ پھر پتہ چلائیں گے۔"

"اس غم کو بھلانے کے لئے اپنی کمائی خرچ کرنا ہو گا گلزار بھائی۔"

"تم نے بڑے کام کی بات اس وقت کہا ہے حیدر بھائی۔"

لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دونوں ٹریننگ پا چکے ہیں۔ ان کو عوام کا کام کرنے کا تجربہ اور سرکاری آفسوں کا طریقہ معلوم ہے۔ اب پنچایت کا انتخاب جب ہو مکھیا سرپنچ کے عہدوں پر یہ دونوں ضرور کامیاب ہوں گے۔ ان کو یقین ہے کہ دونوں کی کامیابی سے عوام کی بہت بھلائی اور گاؤں کی خوب ترقی ہو گی۔ پہلے والے لوگ اناڑی تھے جس نے پنچایت کو صرف لوٹا اور برباد کیا۔ لیکن چند لوگ جو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں ان کی تمنا اب یہی ہے کہ آنے والے دنوں کی لیلا دیکھنے سے پہلے آنکھ بند ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔

☆☆

تصور عرش پر ہے اور..........

ہونے دیں گے نہ سحر آج کی رات
ہونے دیں گے نہ سحر...........!

راجندر بھون کے سجے سجائے ہال میں آل انڈیا مشاعرہ کا تصور کر کے خوش گلو شاعر نیاز قادری قد آدم آئینہ میں اپنی تصویر کے روبرو ریاض کرنے میں مستغرق تھے۔ انہوں نے شب تاریک کے ہم رنگ شروانی زیب تن کر رکھا تھا۔ گیسو وابرو سنوارے عبداللہ کیپ زلف کے اوپر سجایا، سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے گلی میں اچھال دیا اور پان کی گلوری منہ کے رحم و کرم پر چھوڑی اور چہرے کے اتار چڑھاؤ اور سرگیں آنکھوں کو مختلف زاویوں میں گھمانے پھرانے کے بعد ان کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر ریاض کی ابتدا کی تھی۔

نیاز قادری نے مشہور شاعر جگر مرادآبادی کی کاپی کرنے میں اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا تھا وہ مترنم آواز اور سوز و گداز کے ساتھ اپنی اداؤں' حرکات و سکنات چشم و ابرو کے اشاروں کنایوں کا باریک بینی سے جائزہ بھی لے رہے تھے اور ان کے کمرے سے اس طرح کی آوازیں باہر جھانکنے کی گستاخانہ جسارت کر رہی تھیں۔ حضرات اس شعر پر خصوصی توجہ چاہوں گا متوجہ ہوں کرم ہوگا...... یہ شعر برائے خاص...... شعر ضرور پسند آئے گا...... مطلع عرض کیا ہے۔ ہونے دیں گے نہ سحر...... بار بار...... آج کی رات...... بار بار حضرات مطلع عرض کیا ہے سماعت فرمائیں گے...... جسارت غور طلب ہے...... مطلع پیش خدمت ہے......!

ہونے دیں گے نہ سحر آج کی رات!
وقت جائے گا ٹھہر آج کی رات!!

نیاز قادری نے راجندر بھون میں منعقد ہو رہے آل انڈیا مشاعرہ کو ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا اس مشاعرہ میں وہ آواز کے اعتبار سے اپنے ہم عصر شاعر مفتی حمیدی کی مٹی پلید کر کے مشاعرہ کا سارا کریڈیٹ لوٹنے کا عزم محکم کیے ہوئے بھرپور تیاریوں میں مصروف عمل تھے۔ ریاض کرتے ہوئے خود فراموشی کا عالم یہ تھا کہ پہلے محل کا تیسرا لڑکا جمال قادری کے پشت پر کھڑے ہونے کا احساس تک نہ تھا وہ غزل کو آخری ٹچ دیتے ہوئے فرط انبساط اور شدت جذبات میں شاخ گل کی طرح لچک لچک کر مدہوشی میں جھوم رہے تھے حالات کی تبدیلی سے مایوس ہو کر لڑکے نے دامن کو کھینچتے ہوئے روہانسی آواز میں پکارا۔

پاپا ـــــ پاپا ـــــ !!! ادھر آپ آنکھ بند کیے ہوئے ہیں اور ادھر چھوٹی امی جان......؟!

"اچانک سلطانہ قادری کو کیا ہو گیا بیٹے؟" چھوٹی کا نام سماعت سے ٹکراتے ہی تصورات کی حسین محفل درہم برہم ہو گئی۔ چہرے سے خوشیوں کو دھکیل کر غم واندوہ نے اپنا قبضہ قائم کر لیا۔ گھبراہٹ بھری آواز میں لڑکے سے پوچھنے لگے "خیریت تو ہے نا بیٹے"

"خیریت ہوتی تو میں کیوں پریشان ہوتا۔ نکاح ثانی کے باعث جس طرح قادری کی محبت تقسیم ہو گئی تھی۔ بچوں پر اس کا رد عمل ہوا تھا اس نے پھر بیدلی سے بتایا۔

"بستر پر پڑی کراہ رہی ہیں اور آپ کی طرح آنکھیں بند ہیں۔"

"آنکھیں بند ہیں کا کیا مطلب ہے صاف بتاؤ بیٹے؟" وہ تڑپ اٹھے "میں ہر حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں" "مطلب صاف ظاہر ہے ان کی روح جسم ناتواں میں پھڑپھڑا رہی تھی اور لڑکا لاپروائی سے کہہ رہا تھا" آپ آنکھیں بند کر کے گانا گا رہے تھے۔ اور وہ کلمہ پڑھ رہی ہیں۔

"لاحول ولاقوۃ میں گانا نہیں گا رہا تھا نادان لڑکے غزل پڑھ رہا تھا۔ اسی سے تمہارے نصف درجن بہن بھائیوں کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے کم بخت وہ دکان بند کر کے بڑبڑائے اور لڑکے کا ہاتھ تھامتے ہوئے گھر کی طرف تقریباً دوڑتے ہوئے بڑھے، جو بہت دور نہ تھا۔ ان کی زبان پر خدا خیر کرے کا ورد جاری تھا۔

نیاز قادری سے میری پہلی ملاقات نسیم احمد کی تربیت گاہ میں ہوئی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب ادب کے پجاری سیتا مڑھی جاتے تو ادبی پیر نسیم احمد کی زیارت ضرور کرتے تھے وہ پیکر انسانیت خلوص مجسم اور مرنجان مرنج قسم کے انتہائی ذہین انسان تھے وہ کتنی ہی تحریکوں کے محرک انجمنوں، اور اداروں کے روح رواں اور علوم کا مخزن تھے، وہ قادر الکلام شاعر، انشاپرداز اور پیدائشی ادیب تھے۔ نسیم احمد نے مجرد زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تو اردو کی خدمت کے لئے اپنا جیون دان کر دیا۔ انہوں نے...... اپنی اولاد پیدا نہیں کی۔ مگر اردو کی خدمت کے لئے شاعر ادیب پیدا کرتے رہتے تھے خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ وہ حیات سے تھے تو مہسول چوک گہوارہ اردو اور ان کی قیام گاہ اردو کا مرکز مسکن اور منارہ تھے صدائے عام تھی کہ بحر ادب میں غوطہ لگا لے جس کا جی چاہے۔ جس وقت میں نسیم احمد کے حجرہ نما کمرے میں داخل ہوا نیاز قادری زانو تہہ کئے مشق سخن میں مستغرق تھے مجھے دیکھتے ہی نسیم احمد نے روایتی شاعرانہ انداز میں میرا استقبال کرتے ہوئے پرمسرت انداز میں کہا” آپ نیاز قادری ہیں۔ شعر و شاعری کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں“ ”مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی“ میں نے اپنے تاثرات ظاہر کئے” اپنا قیمتی وقت قربان کرنے والے مجاہدین اردو میں ایک اضافہ ہوا۔

ادھر ادھر کی بات کر کے تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت لے لی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری موجودگی انہیں گراں گزر رہی تھی۔ مگر نیاز قادری سے چھوٹی سی ملاقات تعلق کے سلسلوں میں ڈھل گئی۔

جیسے کسی مفلس کو سرمایہ ہاتھ لگ جائے۔ جس طرح کسی کافر ادا پر شباب آ جائے وہ رکھتے ہیں کہیں پاؤں اور پڑتے ہیں کہیں اور کی حالت ہوتی ہے۔ نیاز قادری بھی انہیں حالات سے گزر رہے تھے اس نے ادبی دنیا میں قدم کیا رکھا اپنا سب کچھ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس میں خود کو ایک شاعر کے روپ میں ڈھالنے کے ساتھ ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ کی رفاقت کا خطرناک ارادہ بھی شامل تھا ان کی شریک غم رضیہ زیور تعلیم سے آراستہ نہ تھی۔ وہ ان کی ادبی حیثیت اور شاعری کو سمجھنے سے قطعی نابلد ہی نہ تھی بلکہ اس کو تضیع اوقات اور خانہ

بربادی تصور کرتی تھی اور اکثر ان کے درمیان کشیدگی رہتی تھی جس سے تصورات کی حسین وادی میں بگولے اٹھنے لگتے تھے اور غزل کے پھولوں کی پتیاں جھلس کر بکھر جاتی تھیں۔ وہ اپنے خوابوں کے تعبیر کی جستجو میں بے قرار رہتے تھے اگر جذبہ صادق ہو تو تلاش کرنے والوں کو لعل وگہر مل ہی جاتے ہیں۔ سلطانہ قادری بھی ان کی شب گزار راتوں کی دعاؤں کا حاصل تھی۔

ایک غریب والدین سے اپنی خوبصورت بیٹی کو معقول تعلیم دلانے کا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ اس کے سپنے اور ارمان ایک بوجھ بن کر رہ گئے تھے ان کی برابری کے لوگ گدڑی کے لعل کو اپنے جاہل بیٹوں کے گلے میں ڈال کر ان کی زندگی اور اپنا گھر برباد کرنے کو تیار نہ تھے اور اس کے لئے لائق لڑکوں کو خریدنے کی مفلس والدین کی صلاحیت نہ تھی ان حالات میں نیاز قادری کا پیغام انہیں تاریکی میں ایک کرن کی طرح معلوم ہوا تھا۔ مردوں کے لئے عمر کی قید نہیں ہوتی۔ دنیا نے انہیں خصوصی اختیارات عطا کئے ہیں شاعر وادیب ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کر کے ڈگریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ مایوس دلوں نے تعلیم کا سہارا لے کر نجات کی راہ تلاش کر لی اور خود سلطانہ والدین کی بے بسی اور جذبات کا خیال کر کے خودکشی کے بجائے عروس نو کا جوڑا زیب تن کر کے نیاز قادری کے ہرے بھرے گھر میں چلی آئی جہاں اس وقت نہ جانے کس تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اور نیاز قادری دل کی بے چینیوں پر بمشکل قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تیزی سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

نیاز قادری باد و باراں کے تند جھونکوں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے وہ بدحواس سی بے سدھ پڑی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہی دل بے قرار پر قابو نہ رکھ سکے سرہانے بیٹھتے ہی بے چین دل سینے سے باہر نکل آیا ''اچانک تمہیں کیا ہو گیا۔ سلطانہ قادری خدا خیر کرے۔'' بچوں کی نظر بچا کر ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے فکرمندی کا اظہار ''کیا کل مشاعرہ میں شریک ہونا ہے۔ ایسے میں بدشگونی کہ دشمنوں کی طبیعت علیل ہے الاماں والحفیظ''

''یہ مشاعرہ کی بدشگونی کا ہی تو اثر ہے'' جیسے دبی چنگاری اچانک شعلہ بن گئی ہو۔ وہ کروٹ بدلتے ہوئے نقاہت سے کہنے لگی ''اس کے نام سے ہی مجھے ابکائی آتی ہے اور حالت بگڑ جاتی ہے یہ مشاعرہ کسی دن میری جان لے کر رہے گا۔

''خدا کے لئے ایسی باتیں اپنی زبان سے ادا نہ کرو سلطانہ قادری تم تعلیم یافتہ سخن فہم اور باصلاحیت خاتون ہو'' سلطانہ کے ارادوں اور خطرناک تیور کو بھانپنے سے قاصر وہ کانپ کر رہ گئے۔ وہ خوشامدانہ لہجہ اپنائے ہوئے تھے مگر سلطانہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نگاہ کرم کی کوئی گنجائش کا کہیں پتہ نہ تھا وہ تو اس گھڑی کوئی اور ہی مہلک ارادے کئے ہوئے تھی۔ تبھی وہ شدید تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے مسند کے سہارے بیٹھ کر اپنے خیالات سے آگاہ کرنے لگی۔

''آپ شاعری وائری کے چکر میں گھر کی فکر بھول بیٹھے ہیں'' قادری اپنی صورت پر مسکنیت طاری کئے ستمگر کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے تھے اور وہ فرما رہی تھی۔ ''تین اہم باتوں کا آج فیصلہ کرنا ہے اول یہ کہ اپنے پیاروں کو اگر خود سنبھال نہیں سکتے تو انہیں کی یتیم خانہ میں جاگیر دلوا دیں وہاں پرورش اور تعلیم بھی ہو جائے گی مولوی بھی ہو گیا تو آپ کی شاعری کو سمجھے گا۔ بیاض کو سنبھال کر رکھے گا اور آپ کے بعد کسی اکیڈمی کا بیوقوف سکریٹری مہربان ہو گیا تو کبھی آپ کا دیوان بھی چھپوا دے گا۔

''رحم کرو سلطانہ قادری کیا آج تم نے مجھے ستانے کی قسم کھا رکھی ہے'' سلطانہ کی طرف مسکنیت سے دیکھتے ہوئے عاجزی سے کہہ رہے تھے'' کیا جیتے جی تم مجھے مار دینا چاہتی ہو؟ نیاز قادری کے ساتھ مرحوم کا اضافہ تمہیں زیب دیتا ہے؟''

کام نکالنے کے لئے باپ کے خانے میں کوئی اور نام لکھوانے میں حرج کیا ہے؟ جیسے اپنی شاعری میں جانے کسی بے حیا اور منحوس محبوباؤں کی محبت وصال و فراق اور بے وفائی کے افسانے لذت کے ساتھ بیان کر کے فرماتے ہیں سب تمہارے مختلف نام اور تمہارے جلوے ہیں۔ میرا خواب، میرا خیال اور تصور تو صرف تم ہو''

نیاز قادری کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ بات بگڑ جانے کے خوف سے ہمیشہ کی طرح سپر ڈالے خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ ان کی حالت پر ترس کھانے کی بجائے اپنی دھن میں کہہ رہی تھی۔

بچوں کو یتیم خانہ بھیجنے میں سبکی ہوتی ہے تو چھوڑ دیجئے۔ انہیں ممبئی روانہ کر دیجئے

سوٹ کیس بنا کر روزی تو کمائے گا۔ بڑے شہر جانے سے ویسے ہی بولنے اور لباس پہننے کا سلیقہ آجاتا ہے اگر کمائی کا اچھا موقع مل گیا تو بغیر تعلیم کے بھی قابل ہو جائے گا، اس نے قادری کو بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”دوسری بات یہ کہ آپ نے اپنی غزلوں کو فریم کرا کے دیواروں پر کچڑا پھیلا رکھا ہے اس سے دیوار کو پاک کیجیے۔ مجھے فریم سے آپ کی کوئی محبوبہ بھوتنی اور چڑیل کی طرح جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے میں انہیں ایک لمحہ برداشت نہیں کر سکتی میں کمرے کو پاک وصاف کر کے ان بدروحوں سے نجات کے لئے منقبت اور تعویذ آویزاں کروں گی۔“

”اپنے ترکش کا آخری تیر بھی عنایت کیجیے بندہ سینہ سپر ہے“ وہ بے تابی سے خالص شاعرانہ انداز میں بولے سلطانہ کی باتیں جہاں پھول بکھیرا کرتی تھیں اس وقت اس کے ہر لفظ سے شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سلطانہ نے ان کی فرمائش کے احترام میں آخری تیر اس طرح چھوڑا کہ شہادت بھی نصیب نہ ہو بلکہ نیم بسمل قدموں میں تڑپتا رہے مگر راہ فرار بھی حاصل نہ کر سکے۔

”اگر آپ کی محبت کا دعویٰ جھوٹا نہیں ہے تو...... میرے لئے میرے لئے کل کا مشاعرہ ملتوی کر دیں!“ قاتل نے رگ جاں پر چھری پھیرتے ہوئے جیسے غرور اور فتح مندی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اچانک جگر میں تیر پیوست ہو جانے والے بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔

”سلطانہ قادری...... سلطانہ قادری...... اتنے سخت امتحان مت لو، ایسی آزمائش میں مت ڈالو کہ دم نکل جائے۔“ وہ شدت جذبات میں اس کا دونوں ہاتھ تھام کر پیر ڈالتے ہوئے تقریباً رو دینے کی آواز میں گڑگڑا رہے تھے۔ میری حالت پر رحم کرو...... ترس کھاؤ خدا کے لئے...... برسوں کی رفاقت کا واسطہ...... میں برداشت نہ کر سکوں گا...... کرم کرو ورنہ میری روح پرواز کر جائے گی!“

غیر دلچسپ ماحول اور انجانی باتوں سے بور ہو کر بچے کمرے سے جا چکے تھے اس کا نیم جاں شکار قدموں میں تڑپ رہا تھا۔ نیاز قادری کی قابل رحم حالت پر آخر اس ستم شعار

کو ترس آ ہی گیا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر کواڑ کے دونوں پٹ متصل کر دیئے۔

دروازے کا پٹ دھیرے سے جدا ہوا اور کمرے میں روشنی در آئی۔ نیاز قادری کے سکون آمیز چہرے پر مسکراہٹ لرزاں تھی۔ ان کے درمیان مستقبل کے خاکے پر دستخط ثبت ہو چکے تھے جس کے تحت لڑکے قسمت کے بھروسے خاک نوردی کریں گے مشاعروں کے نذرانے سلطانہ قادری کے خوبصورت ہاتھوں کی زینت کو دوبالا کریں گے اور فریم شدہ غزلیں اسی وقت دیوارں سے اتار کر بڑی والی کے بکس میں محفوظ کر دیئے جائیں گے۔ ”آپ دیوار سے فریم اتاریں میں آپ کا کھانا لگائے دیتی ہوں۔“ وہ کسی فاتح کی طرح ادائے بے نیازی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور نیاز قادری تیزی کے ساتھ دیواروں سے فریم اتارنے لگے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ فتنہ گر اپنے فیصلے تبدیل نہ کر دے۔

☆☆

چارہ گر

نرسنگ ہوم کے باہر لوگوں کی کافی بھیڑ جمع ہوئی تھی ایک بیوہ کی خوبصورت لڑکی سدھا کو سخت مزاحمت اور تعاقب کرنے والوں کے خوف سے اغوا کاروں نے ریوالور سے گولی چلا کر مجروح کر دیا تھا گولی بازو زخمی کرتے ہوئے نکل گئی تھی لیکن دہشت اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے لڑکی بیہوش ہوگئی تھی اسے بے ہوشی کی حالت میں سرکاری ڈاکٹر کے پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر آپریشن کرنے میں مصروف تھے اور لوگ لڑکی کی حالت اور واقعہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے۔

تھانیدار سپاہیوں کو بھیڑ منتشر کرنے کا حکم دیتا ہوا ڈاکٹر کے سامنے پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ڈاکٹر پرساد آپریشن تھیٹر سے فارغ ہو کر آگئے تھے اور ذہن کی تسکین کے لئے سگریٹ کا ہلکا ہلکا کش لے رہے تھے۔ تھانیدار سے انہوں نے نرم لہجہ میں کہا۔

”آپ تحقیقات کا اور کام کیجئے لڑکی بے ہوش ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کا بیان لے لیجئے گا۔“

تھانیدار کے باہر نکلتے ہی ایک خستہ حال بڑھیا ڈاکٹر کے سامنے پہنچ گئی اس نے کرب و غم سے نڈھال آواز میں پوچھا۔

ڈاکٹر بابو سدھا اب کیسی ہے؟

ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے کوش دلی سے بتایا جس سے اس کے ڈوبتے دل کو بہت سہارا ملا۔ ڈاکٹر کی سوالیہ نگاہوں کو بھانپتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ”سدھا میری بیٹی ہے بابو“ سندرتا اس کے

جان کی دشمن بن گئی ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ میں ودھوا بھاری سنکٹ میں ہوں۔ لڑکے بہو کے ساتھ پردیش میں رہتے ہیں۔ بھگوان ہی رکشا کریں گے آپ اسے اچھا کردیں بڑی کرپا ہوگی۔ ''ڈاکٹر کی فیس اور دوا کا دام لائی ہو ماں جی۔ بڑھیا کی دکھ بھری کہانی سے متاثر ہونے کے بجائے ڈاکٹر کو فیس کی فکر ستانے لگی۔ بڑھیا نے آنچل میں بندھے ہوئے کچھ نوٹ ڈاکٹر کی ٹیبل پر رکھ دیئے جسے گننے کے بعد ڈاکٹر بولا۔

''یہ تو صرف ساڑھے تین سو ہیں'' ''باقی فیس کل ادا کردوں گی۔''

''کوئی بات نہیں لیکن کل روپیہ کا انتظام ضرور کرلینا ماں جی۔ یہ ہم لوگوں کا بزنس ہے یہاں بہت دھیان سے علاج ہوتا ہے۔ سرکاری اسپتال نہیں ہے۔ وہاں فیس نہیں لگتی ہے تو علاج بھی نہیں ہوتا ہے۔ ہم لوگ علاج کر کے مرنے نہیں دیتے ہیں اور سرکاری اسپتال سے کوئی قسمت والا ہی زندہ بچ کر کے اپنے گھر جاتا ہے۔

ڈاکٹر کو شاید زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ اپنی بات ختم کر کے وہ اٹھ گیا اور بڑھیا کو سدھا کے قریب رہنے کی اجازت دیدی۔ وہ سدھا کے پاؤں کے قریب خالی کونہ پر بیٹھ گئی اور سدھا کے زرد چہرے کی بلائیں لینے لگیں اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف کے سائے لہرا رہے تھے ماں اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور کلینک میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر پرساد وہاں سے دکھائی پڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر پرساد خوبصورت جسم کا مالک اور ابھی کنوارا تھا۔ چھوٹی ذات کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا۔ لیکن گھر والوں کی مرضی کے خلاف اسے اپنانے کی جرات نہیں تھی۔ ڈاکٹر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے تھانیدار سے مخاطب ہوا جو بیان لینے پھر آ گیا تھا۔

تھانیدار صاحب لڑکی تو ہوش میں آئی تھی۔ لیکن درد کی زیادتی کی وجہ سے دوا کے ذریعہ اسے پھر سلا دیا گیا ہے۔ ویسے وہ ڈری ہوئی اور نروس بھی ہے۔ اچھا ہوگا کہ کل صبح آٹھ بجے کے بعد آپ آجائیں۔

تھانیدار الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ وقت زیادہ ہو گیا۔ اور اسٹاف جا چکے تھے۔

ڈاکٹر نے سدھا کا معائنہ کیا اور اپنے کواٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جو نرسنگ ہوم کے عقب میں واقع تھا۔ بوڑھی نرس نے سدھا کی ماں کو ڈسپنسری کے ایک کونے پر آرام کی جگہ دے دی اور سدھا کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ بوڑھی نرس اندر ہی رہ گئی تھی۔

صبح آٹھ بجے ماں سے سدھا کو ملنے کا موقع ملا۔ وہ کتنے اذیت ناک کرب سے گزری تھی ماں کو معلوم نہ تھا۔ ماں بے حد خوشی کے ساتھ اس کے قریب گئی۔ لیکن سدھا کے ملول چہرے اور اشکبار آنکھوں کو دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے تڑپ کر سدھا کو سینے سے لگا لیا۔ سدھا ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں کے ڈھارس بندھانے کے باوجود خود پر قابو پانے کی کوششوں میں ناکام تھی۔ ماں اس کا درد سمجھنے سے قاصر تھی اس نے ہچکیوں کے دوران سرگوشیوں میں جو کچھ بتایا۔ اس سے ماں کے صبر کا بندھ بھی ٹوٹ کر رہ گیا اس چوٹ نے انہیں نڈھال کر دیا اور پھر دونوں اپنی بدنصیبی اور بے بسی پر آنسو بہانے لگیں۔

سامنے سے تھانیدار سدھا کا بیان لینے آ رہا تھا۔ ماں نے اپنے ساتھ سدھا کا بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ آنچل سے پوچھتے ہوئے سمجھایا۔ اس گھٹنا کی چرچا مت کرنا بیٹی۔ چپ رہنا ہی اچھا ہے۔ اس سماج سے انصاف کی آشا تو ہے نہیں۔ آج تو صرف عزت برباد ہوئی ہے منہ کھولو گی تو بدنام بھی ہو جاؤ گی۔

سدھا کا بیان سپرد قلم کر کے تھانیدار واپس ہو گیا۔ جسم کے گھاؤ کے متعلق تو اس نے بیان دیا۔ پولیس مجرم کو عدالت کے سپرد کرے گی اور عدالت اسے سزا دے گی مگر وہ روح کے زخموں کا ذکر بھی نہ کر سکی اس کی فریاد کس سے کرے؟ کوئی عدالت ہے جو اس ظالم ڈاکٹر کو سزا دے سکے؟ یہ کیسی بے بسی ہے کیسی مجبوری!!

سورج مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ سدھا کی گھبراہٹ اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اب کسی قیمت پر نرسنگ ہوم میں ٹھہرنے کو تیار نہ تھی اس کے سامنے شیطانی ہیولے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور اس کی ضد کے باوجود ڈاکٹر جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ مرض بڑھ جانے کا بہانہ بنا رہا تھا۔ دفعتاً تھانیدار

کلینک میں داخل ہوا اور اپنی آمد کا مقصد بتانے لگا۔

خفیہ طور پر پتہ چلا ہے کہ لڑکی بہت خطرے میں ہے۔ اس کو پولس کی حفاظت میں رکھنا ضروری ہے۔ میں اس کو تھانہ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

ڈاکٹر نے تھانیدار کے کرخت چہرے کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے لڑکی کو تھانہ لے جانے کی اجازت دیدی۔

نرسنگ ہوم سے باہر نکلتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے جہنم سے نکل آئی ہو اور شیطان کے چنگل سے نجات مل گئی ہو۔ دونوں ماں بیٹی نے جاتے ہوئے انتہائی نفرت اور حقارت سے ڈاکٹر کی طرف آخری بار دیکھا۔ ان کے دل کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر انسانیت کی خدمت کرتا ہے۔ زندگی بانٹتا ہے اور لوگوں کو موت کے ظالم پنجوں سے نجات دلا کر راحت پہنچاتا ہے۔ وہ مسیحا کہلاتا ہے لیکن ڈاکٹر پرساد تو اس مقدس پیشے کے نام پر بدنما داغ ہے جو جسم کا علاج کرتا ہے مگر روحوں کو دائمی زخموں کی کسک دیتا ہے ان کے دلوں میں طوفان تھا وہ بہت کچھ کہتی؟ مگر وہ ایک بے سہارا اور مجبور لڑکی تھی!

وہ دونوں تھانے میں بینچ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ آنے والے لمحات سے بے خبری بھی اندیشے کا سبب تھی ان کے چہروں سے اکتاہٹ اور ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ اچانک تھانیدار سامنے کے کمرے سے نمودار ہوا۔ اور اس نے لیڈی کانسٹبل کو بلا کر حکم دیا۔

''اس کو اپنے کوارٹر میں لے جاؤ لڑکی تمہاری نگرانی میں رہے گی۔ اس کی حفاظت کا پورا خیال رکھنا اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے ہی بے چاری بہت دکھی ہے۔''

''ماں جی آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔ لڑکی پولس کی تحویل میں ہے۔ اب اس پر آنچ بھی آنے نہیں دیں گے۔ آپ دن میں ملاقات کر لیا کریں گی۔''

تھانیدار ان سے بات کرنے کے بعد پھر اسی کمرے میں چلا گیا جس سے باہر آیا تھا۔ شاید وہ اس کی آفس تھی۔

لیڈی کانسٹبل کے ہمراہ جاتے ہوئے سدھا بار بار مڑ کر ماں کی طرف دیکھ رہی تھی

اور تھانہ سے باہر نکلتے ہوئے ماں کا بھی یہی حال تھا۔ جیسے کوئی شکاری ہرنی کے بچے کو پکڑ کر لے جا رہا ہو اور وہ سوائے آنکھ نم کرنے کے کچھ بھی نہ کر سکے۔ دونوں کے دلوں میں انجانے وسوسے ہلچل مچا رہے تھے...... جدائی بے حد شاق گزر رہی تھی۔ بس ایک موہوم سی امید تسلی اور بھروسے کا باعث تھی کہ وہ لیڈی کانسٹبل کی حفاظت میں رہے گی۔ جو بہرحال ایک عورت بھی ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ پولس عورت مرد نہیں ہوتی۔ ہندو مسلمان نہیں ہوتی اور چھوٹی ذات اور بڑی ذات بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف پولس ہوتی ہے۔ پولس انھیں لوٹ لیتی ہے جو لوگ لٹیروں سے بچ جاتے ہیں ملک اور قوم کو چونا لگانے کا نظام ان کے دم قدم سے قائم ہے۔

اس رات قانون کی سرپرستی میں دھرتی پر ظلم اور جبر کی ایک اور کہانی دہرائی گئی۔

صبح کی کرنوں میں اس کا عکس جھلک رہا تھا۔ اور آکاش پر سورج شرم سے منہ چھپانے کے لئے بادل کا ٹکڑا تلاش کر رہا تھا۔ مگر ابلیس کے بندوں کو اپنے کرتوت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ حرامکاری کی انتہا نے انہیں انسانی اقدار اور شرم و حیا سے بے گانہ بنا دیا ہے وہ صرف انسان کا پتلا بھر رہ گئے ہیں۔ انسانیت، ایمان اور دھرم کا شائبہ تک ان میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔

لیڈی کانسٹبل کے کوارٹر کا منظر بے حد دردناک تھا۔ سدھا بے ترتیب پڑی ہوئی تھی اور اس کا جسم نیم عریاں تھا۔ وہ لٹیروں کو محافظ سمجھنے کی بھول کر بیٹھی تھی۔ بھیڑیوں کو انسان مان لینے کی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ کوئی اس ماں کے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے۔ جس کی اولاد بھیڑیوں کا شکار ہوئی ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے سدھا کے نیم مردہ جسم پر گر پڑی اور دھاڑے مار کر رونے لگی۔ شاید ان کی بے بسی اور اس اندوہناک منظر کو دیکھ کر ہر مقام پر موجود ہر شئے کو دیکھنے والی اور دلوں کا راز جاننے والی پاک ہستی کے بھی آنسو نکل پڑے ہوں گے مگر ان کے غموں کا مداوا اور زخموں کا مرہم لے کر دوڑنے کے بجائے ایک مکروہ صورت ظالم سپاہی نے اس کے رونے پر بھی پابندی لگا دی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ گرجا۔

''او بڑھی چپ چاپ رہ تیرا لوگ تھانے میں آئے ہوئے ہیں زیادہ ہلا غلامت کرو ورنہ پچھتائے گی۔''

قدرت نے غریبوں، بے کسوں اور دردمندوں کو آنسوؤں کا بے بہا مرہم عطا کیا ہے۔ یہ غموں کا مداوا نہ سہی مگر ان کا سہارا ہے آنسو جو دلوں کی آگ پر شبنم کی پھوار بن کر راحت پہنچاتا ہے لیکن ان سے رونے کا اختیار بھی چھین لیا گیا ہے۔ مگر ان کے رونے کی صدا نیتا جی کی سماعت پر دستک دے چکی تھی۔ ان کے تجربہ کار ذہن نے تاڑ لیا کہ کوئی راز چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بے دھڑک کوارٹر میں داخل ہو گئے۔ کمرے کا نظارہ دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت اور تعجب سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ دھوتی کا پلو سنبھالتے ہوئے فرش پر بیٹھ گئے اور ان کی داستان الم سن کر وہ چیخ اٹھے۔

قانون کی رکھوالی کے نام پر تم لوگ بدنما داغ ہو۔ کلنک کا ٹیکہ ہو، ڈاکوؤں اور ظالموں کو پولس کی وردی پہنا دی گئی ہے۔ میں تمہاری وردی اتروا دوں گا اور برخاست کرا کے جیل بھجوا دوں گا۔ تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو۔ تم اپنے انجام کے لئے تیار رہو۔ میں ابھی کھ منتری سے فون پر بات کرنے جا رہا ہوں......

نیتا جی اپنی پوری طاقت سے چلا رہے تھے۔ غصہ کے مارے ان کا جسم کانپ رہا تھا اور تھانیدار اپنے اسٹاف کے ساتھ سائبان میں مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

نیتا جی سدھا اور اس کی ماں کو اپنی گاڑی سے پارٹی آفس میں تھانہ سے لے آئے۔ انہیں بہت عزت کے ساتھ آفس کے پچھلے حصہ میں ٹھہرایا گیا وہ حصہ زنانخانہ کے طور پر بنا ہوا تھا۔ دو کمروں کے سامنے چھوٹا سا آنگن بھی تھا۔ کمرے میں بستر لگا تھا۔ شاید وہ نیتا جی کے آرام کرنے کا کمرہ تھا۔ ایک ڈاکٹر سے سدھا کے زخموں کی پٹی درست کرا دی گئی اور دوا کے علاوہ ان کی ضروریات کا سارا انتظام کر دیا گیا۔ دونوں ماں بیٹی اس سہارے کو بھگوان کی غیبی امداد سمجھ کر کسی حد تک مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ اور ان کی نگاہوں میں نیتا جی دیوتا کی طرح لگ رہے تھے۔

پولس کے ظلم اور زیادتی کے خلاف شہر میں زبردست ہڑتال کے تحت تمام دکانیں بند اور سڑکوں پر سواریوں کی آمد و رفت پر روک لگا دی گئی۔ پولیس والے جیسے تھانے میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ مظاہرین کے غم و غصہ کا سامنا کرنے کی ان میں جرات نہیں تھی۔ شریفوں

کو ذلیل کرنے والے خود سرِعام رسوا اور ذلیل ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر بھی نرسنگ ہوم بند کر کے فرار ہو گیا تھا۔ آزاد چوک پر عوام سے خطاب کر کے نیتا جی آفس آ گئے تھے۔ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے انہیں مکھ منتری سے ملنے جانا تھا۔ راجدھانی کے سفر پر روانگی سے پہلے وہ سدھا کی خبر لینے آئے۔

“اب طبیعت کیسی ہے سدھا”

سدھا لیٹی ہوئی تھی نیتا جی کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ معصومیت سے بولی “آپ کی کرپا سے اب ٹھیک ہوں”

“کرپا ورپا مت کہو۔ سماج کی سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے۔ ہم کسی پر احسان نہیں کرتے۔ وہ مقصد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ اس وقت میں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں تمہارے سوال پر مکھ منتری سے بات کرنے راجدھانی جا رہا ہوں۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم لوگ آفس میں آرام سے رہو گی۔ تمہاری حفاظت کے لئے بھی آفس میں رہنا ضروری ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اگر میں منتری بن گیا تو تم کو کسی نہ کسی سرکاری نوکری میں رکھ دوں گا۔ نیتا جی اپنی بات ختم کر کے ان کے چہروں پر اس کا ردعمل دیکھنے لگے۔ وہ نگاہیں جھکائے خاموش رہی مگر ماں نے احسان مندی اور انتہائی عاجزی سے کہا۔

“اب ہم غریب اور بے سہارا آپ کی سرن میں ہیں۔ آپ کی کرپا ہو گی تو ہمارا کلیان ہو جائے گا۔”

نیتا جی جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے کہہ گئے۔ “اب کوئی چنتا نہیں کرنا سمجھو دکھوں سے مکتی مل گئی” ان کے ٹوٹے ہوئے دل ہمدردی اور پیار کے دو میٹھے بول کے بھوکے تھے۔ نیتا جی امداد ہمدردی اور انتہائی شفقتوں کے ساتھ مستقبل کے سہانے خواب سونپ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ سارے غم جیسے بھول گئیں۔ ان کی آنکھوں میں اعتماد اطمینان اور امید کی جھلک تیر رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے ڈوبتے سفینے کو ناخدا مل گیا ہے۔

نیتا جی کو راجدھانی گئے دوسرا دن تھا۔ ان کے غائبانہ میں بھی پارٹی والوں کے

سلوک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کی ہمدردیوں اور اپنائیت نے ماں بیٹی کے زخموں سے چور دلوں پر مرہم کا کام کیا تھا اور وہ بشاش نظر آرہی تھیں اور زخم مندمل ہو رہے تھے۔ مگر اس رات ان کی کشتی حیات کو ایک بار پھر بھنور میں گرداب بلا نے اپنے حصار میں سمیٹ لیا۔

اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے کسی نے سحر کردیا ہو۔

اچانک جسم کی توانائی سلب ہوتی جارہی تھی۔ سر چکرانے لگا تھا اور نگاہوں کے سامنے نیلے پیلے سائے رقص کرنے لگے تھے۔ وہ اپنی کیفیت کہہ بھی نہ سکیں اس کا موقع بھی نہ ملا اور وہ جس حالت میں تھیں وہیں ڈھیر ہوگئیں دنیا سے بے خبر! سارے غموں سے بیگانہ!!"

سدھا ہوش میں آئی تو درختوں پر پرندوں کی آہ وزاریاں صبح کی بشارت دے رہی تھیں۔ اس کا ذہن ان لمحات کے دامن کو تھامنے کی کوشش کر رہے تھے جو چھوٹ گیا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا وہ لمحہ جب نگاہوں کے سامنے نیلے پیلے سائے لہرانے لگے تھے...... اور پھر بے خبری میں کیا کیا ہوا؟ اس تصور سے اس کا وجود لرز اٹھا۔ وہ بھیڑیوں کے سلوک سے نابلد تھی۔ صرف اس کی برہنگی اور درد سے کراہتا ہوا جسم اس کی شہادت دے رہا تھا۔ ہمدردیوں کے فریب نے ایک زخم کے بدلے بے شمار زخموں سے اس کی آتما کو چھلنی کردیا تھا اور اعتماد، اپنائیت اور آشاؤں کے سارے محل پل بھر میں مسمار ہوکر رہ گئے تھے۔ ناقابل برداشت اذیتوں کا کرب برداشت کرتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ کمرے میں تنہا تھی اور ماں؟ اس نے کمرے کا جائزہ لینے کے لئے نگاہ اٹھایا۔ ماں دروازے پر مبہوت کھڑی اس کی حالت کو خونبار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ تصورات کی سنگلاخ وادیوں سے بھاگتے ہوئے ماں کے سینے سے لپٹ گئی اس کی کربناک چیخ سے سناٹا کانپ اٹھا۔ ماں......!

تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی ماں؟ بھیڑیوں کے حوالے کر کے کیوں چلی گئی تھی؟ دیکھو اس نے میرا کیا حال کردیا ہے۔ اس نے پیہم اصرار کے باوجود ماں خاموش تھی۔ وہ خود بھی عمر کے آخری حصے میں جن حالات کا شکار ہوئی تھی اسے بتا کر بیٹی کی نگاہ سے گرنا نہیں چاہتی تھی۔

آفس میں خلاف معمول سناٹا تھا۔ ہر طرف منحوسیت کے سائے بھٹک رہے تھے

وہ دوڑتے ہوئے سڑک پر نکل آئیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بدلے شعلے نکل رہے تھے۔ کاش یہ شعلے انسانیت کے بھیس میں چھپے ہوئے بھیڑیوں کے وجود سے اس دھرتی کو پاک کر سکتے؟ مگر وہ شعلہ تو ان کے وجود کو بھسم کیے دے رہا تھا۔ یہ خود ان کے شعلے اور بڑھیں گے......اور بھڑکیں گے......تب پھر کبھی نہ کبھی انسانیت کے لباس میں چھپے ہوئے شیطانوں کو جلد کر بھسم کر دیں گے۔

"یہاں ہر بھیس میں درندہ چھپا ہے ماں، ان کے لبادے اور نام الگ ہیں تو کیا ہوا ان کے اندر شیطان ایک جیسا ہے۔ مظلوم اور مجبور کا کوئی سہارا نہیں ہوتا اور ظالم کے لئے کوئی عدالت نہیں ہے۔ سنسان سڑک پر اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے سدھا ماں سے کہہ رہی تھی۔

"سدھا اپنے دکھ اب سینے میں دفن کر دے" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تیرے بھیا کو معلوم ہو گیا تو وہ آتنک وادی ہو جائے گا اور ہمارا گھرانہ برباد ہو جائے گا۔"

☆☆

عاقبت اندیش فنکار

جب سامنا ہوا تو اتنے تپاک سے بغل گیر ہوئے جیسے کبھی کچھ ہوا نہ ہو!

بلال فاطمی کو اس کا مدقوق چہرہ بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی ہی تو تھی جو اس ہیئت کدائی میں جوہر نایاب پنہاں کر رکھا تھا۔ جیسے محافظت کے لے گدڑی میں لعل چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت بھی اس کیچڑ کی طرح ہے۔ جس میں کنول کے خوبصورت پھول کھلتے ہیں۔ محروم چمن پوری اپنے کباڑ خانے میں پھینکے ہوئے قیمتی اور نادر اشیاء کی طرح ہے۔ جس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیے بغیر بے وقعت سمجھ کر کسی نے کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا ہو۔

وہ خدا کی قدرت کا نمونہ بھی ہے۔ جس کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دیتا، لیکن اس کی تخلیق کی ملک میں دھوم ہے۔ یہ طرفہ تماشہ نہیں تو اور کیا ہے کہ جس کی رومانی غزلیں جوانیاں گنگنا رہی ہیں اسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ اگر خدا کی عطا کردہ میری خوبصورت اور دلنواز آواز اس کی غزل کو نصیب نہ ہوتی تو شاید......!

محروم چمن پوری کے روبرو مشہور اور مقبول شاعر بلال فاطمی مسکراہٹ بکھیر رہا تھا۔ اس نے مصافحہ کے بعد اپنے ہاتھ الگ نہیں کیے تھے۔ جیسے اگر جدا ہو گئے تو شاید نہ مل سکیں گے۔ وہ محروم کی عبادتوں اور دعاؤں کا ماحصل تھا۔ محروم کی نگاہیں اس کے سراپے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ لگتا تھا میر کا کوئی شعر مجسم ہو گیا ہو۔ وہ مشہور شاعر سلیم عابد کی نقل معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز کے سوز و گداز اور انداز میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی تھی۔

قدرت نے ہر شے کو خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کے تماشے بھی عجیب و غریب

ہوتے ہیں۔ جدھر دیکھیے قربان ہو جانے کو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ یہ ہلال فاطمی بھی بے مثال ہے جس نے زندگی میں ایک شعر بھی تخلیق نہیں کیا ہے۔ مگر وہ ملک میں مشہور و مقبول شاعر ہے۔ شہرت و دولت اور عزت اس کے قدموں پر نثار ہو رہے ہیں اور شباب کے ہونٹوں پر اس کی جذباتی غزلیں اور مدھر گیت رقصاں ہیں۔ اس کی سحر انگیز آواز کو میری شاہکار غزلیں نہ ملی ہوتیں تو شاید......!

جب محروم کی غزلوں سے اس کی آواز آشنا نہ ہوئی تھی۔

عبدالرزاق ذہانت کی کوتاہی کے باعث مدرسہ کی پڑھائی اور مولوی کی پٹائی کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے جب لڑکا کوئی کام نہ کرتا ہو تو عملی زندگی کے لئے شادی کر دی جاتی ہے۔ شباب آیا کہ عتاب آیا کہ مصداق اس کے دامن سے فہمیدہ خانم کا رشتہ منسلک کر کے خویش و اقربا اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

عبدالرزاق نے زندگی کا قرض ادا کرنے اور اپنا فرض پورا کرنے کے لئے ملک کے کئی بڑے شہروں کی خاک نوردی کی مگر زندگی کو قرار نہ مل سکا۔ البتہ ناکامیوں اور محرومیوں نے فہمیدہ کی طرح کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ اس نے اپنے متعلق جو بھی سوچ رکھا تھا وہ اس کی منزل نہ تھی۔ دراصل ادب کی بیش بہا خدمات دوراں کو اس مقام تک پہنچنے میں تاخیر تھی جہاں سے اسے ادبی خدمات کے لئے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہا تھا ابھی تک وہ فطرت کے سربستہ ہائے راز سے نا آشنا تھے۔

فطرت خود بخود لالے کی حنابندی کرتی ہے۔ قطرے کو گہر ہونے تک جانے کتنے مراحل طے کرنا ہوتے ہیں اور پتھر ہزار بار تراش خراش کی منزلوں سے گزرنے کے بعد نگینہ بنتا ہے۔ عبدالرزاق کا سفینہ حیات بھی موجوں سے جہاد کرتے ہوئے آبائی وطن کے ساحل لنگر انداز ہوا تو تجربات و مشاہدات سے دل و دماغ کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ لیکن کس کی قسمت کا ستارہ بام عروج پر کب چمکے گا کسی کو کیا معلوم!

قدرت نے اپنی نوازشوں سے کسی کو محروم نہیں کیا ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے چشم بینا چاہئے۔ اس نے عبدالرزاق کو بھی دل نشیں اور غمگین آواز کی دولت فراخ دلی سے نوازا

تھا۔ اس نے حمد و ثنا نعت اور سہرا پڑھنے میں بغیر کسی استاد کا احسان اٹھائے بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ جب وہ مذہبی مجالس میں نعت خواں ہوتا تو سامعین پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور شادی کی تقریبات میں سہرا نوائی کرتا تو محفل لالہ زار ہو جاتی۔ بغیر محنت اور سرمایہ کے اس آزاد مصروفیات میں معقول معاوضہ حاصل ہو جاتا تھا۔ جس سے عظیم شاعر مرزا غالب کی طرح گزر اوقات کے لئے اسے کسی مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا۔ لیکن تقریبات کا سیزن نہ ہونے پر بیکاری گراں گزرتی تھی۔ اسے کسی کارآمد اور مفید مصروفیت کی جستجو تھی۔

عبدالرزاق کے سسر محمد علی کو جوتوں کی تجارت میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ کس کی مجال تھی کہ جوتا کے معاملے میں ان سے منہ لگانے کی جرأت بھی کرے۔ وہ ماضی کی ناکامیوں کے خوف سے خود رسک لینے کے بجائے سسر کی صلاح سے جوتے کی دکان کھول کر فرصت کے ایام میں مصروف رہنے لگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اسی مقام سے جوتے کی طرح اس کی قسمت کا ستارہ چمکنے والا ہے۔

حضرت موسی طور پر آگ کی تلاش میں گئے اور پیغمبری مل گئی۔ سب کو دینے والا اپنی نوازشوں کے لئے بہانے اور اسباب خود فراہم کرتا ہے۔ ایک نیا جہاں عبدالرزاق کا خیر مقدم کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ جس کی ابتدا کے لئے جوتے کی دکان کا ہی انتخاب ہوا تھا۔ وہ دکان میں بیٹھ کر خریدار کے انتظار میں نعت گنگنا رہا تھا۔

ایک رحمت بھری مسکراہٹ ملے دن کی آہٹ ملے۔

میرے چاروں طرف رات سی ہے رواں یا نبی یا نبی!!

ایک عجیب سی ہیئت کذائی کا مدقوق صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ خریدار کی آمد پر اسے خوشی ہوئی۔ وہ کھڑا ہوا اور جوتے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ادب سے پوچھا۔ کیسا جوتا لینا پسند کریں گے بڑے میاں۔

‘‘مجھے جوتا نہیں لینا ہے’’ اس نے اپنی بدصورتی کو مسکراہٹ کی تہہ میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں اہم موضوع پر آپ سے ایک مفید گفتگو کرنے آیا ہوں۔

صبح سویرے اس آدمی نے موڈ خراب کر دیا۔ دل میں آیا کہ دو چار جوتے مفت

میں لگا کر چلتا کردے۔ مگر عوامی زندگی میں اپنے عزت پر ضرب آنے کے خیال سے اس نے اپنے جذبات پر کنٹرول کرتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔ "آپ جوتے کی دکان میں کس موضوع پر اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

بہتر ہوگا کہ پہلے ہم متعارف ہو جائیں۔ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنا تعارف کرانے لگا۔ "خاکسار کو محروم چین پوری کہتے ہیں لیکن تعجب ہوگا کہ ملک میں میری شاہکار غزلوں کی دھوم ہے کئی شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوکر مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کررہے ہیں اور مشہور مغنیوں کی آوازوں میں میری غزل کے درجنوں کیسٹ جواں دلوں میں آتش عشق کے شعلے بھڑکا رہے ہیں۔ لیکن شاید کسی نے یہ شعر میرے لئے ہی کہا ہے کہ

میرے گیت سنے دنیا نے مگر مجھ کو نہ کوئی پہچان سکا۔

"خدا کے لئے رحم کرو بڑے میاں" عبدالرزاق کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اس کی بات کسی طرح قابل اعتنا نہ تھی۔ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "بکواس بند کرو اور چلتے بنو" "میری التجا ہے کہ میرا مدعا سن لیں پھر میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ اپنا مقصد بیان کرنے پر بضد تھا اور بغیر اس کی مرضی کا خیال کرتے ہوئے کہنے لگا۔

میری باتیں تمہیں جھوٹ معلوم ہوتی ہیں تو بالکل غلط بھی نہیں۔ یہ میرا المیہ ہے کہ میں نے کبھی اپنی غزل خود نہیں سنائی اور نہ میں نے اپنے گیت کسی کے سامنے گنگنائے۔ میں کسی اسٹیج پر کھڑا ہونے کے قابل ہی کہاں ہوں۔ میں تو مصور کائنات کا ایک نمونہ ہوں۔ اس نے رومانی جذبات سے لبریز دل اور حسین ترین تصورات سے منور ذہن عطا کیا اور صورت چھین لی۔ شاہکار غزلوں اور مدھر گیتوں کی تخلیق کی بے پناہ صلاحیت بخش دی اور آواز کی خوبصورتی سے محروم کردیا۔ آواز کے بغیر میری غزلیں، میرے گیت، ادھورے اور بے جان ہیں۔ اپنی شاہکار تخلیق کے لئے خوبصورت آواز کی تلاش میں خاک نوردی کررہا ہوں۔

وہ دم لینے کے لئے رکا تو عبدالرزاق نے پوچھا میرے پاس تشریف لانے کا مقصد بیان فرمائیں، وہ اب اس کی باتوں سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔

"ذرا صبر سے کام لیں، اس نے اپنی گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے التجا کی۔ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے ایک سانحہ عظیم کی طرف توجہ چاہوں گا۔ جو میرے لئے قیامت سے کم نہیں۔ جس طرح میری تخلیق شاہکار ہوتی ہے بے بی کوثر ناز بھی میری جستجو کی فخریہ تلاش تھی۔ اسے میں نے اپنی غزلوں کی طرح سنوارا، سجایا اور نکھارا تھا میری غزل اور اس کی مترنم مدہوش کن اور کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی آواز لازم و ملزوم بن گئی تھی۔ جس نے ادب اور محبتوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ میں نے کبھی اس کی جدائی اور ترک تعلق کا تصور نہیں کیا تھا وہ میری جان غزل تھی مگر اس نے ایک سرمایہ دار تاجر کو اپنا کر میری غزل سے اپنی آواز کا رشتہ ترک کر لیا ہے میرے کلام کے مجموعے اپنے نام سے شائع کرا رہی ہے اور غزلوں کی کیسٹ بنوا رہی ہے مجھے اسی طرح خوشی ہے کہ میرا کلام کو خوبصورتی سے شائع ہو رہا ہے اور کیسٹ تیار ہو رہے ہیں۔ جس طرح ایک مفلس اور بے کس ماں اپنے بچے کی راج محل میں پرورش پر شاداں ہوتی ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا غم ہے کہ میرے احسانات کو فراموش کر کے میری تازہ تخلیق سے منہ پھیر لیا ہے آواز کے بغیر میری غزلیں بے جان ہیں۔ تمہارے پاس آواز کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ اپنی آواز سے ان میں روح پھونک کر زندگی دے دوامر کر دو، وہ گڑگڑانے لگا۔

آپ کے مدعا کی تکمیل میں میرا کردار کیا ہوگا؟

اپنی تجویز کا خاکہ پیش کرتا ہوں، عبدالرزاق کو مائل بہ کرم دیکھ کر مسرور ہوتے ہوئے وہ بتانے لگا "میری تخلیق کو اپنی آواز سے فنکارانہ مظاہرہ تم کرو گے۔ کلام کی اشاعت اور مشاعروں میں شرکت سے جلد ہی شہرت حاصل ہو جائے گی۔ پھر عزت شہرت اور دولت قدموں پر نثار ہوں گے۔ عزت مسلمہ تمہارے صرف دولت میں میرا حصہ نصف ہوگا۔ ہماری مشترکہ کاوش انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ میرا خیال ہے یہ تجویز تمہیں یقیناً پسند آئی ہوگی۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے مگر یہ پایہ تکمیل تک پہنچے گا کیسے؟"

"مستقبل سنوارنے کا فرض مجھ پر چھوڑ دیں۔" اپنی کامیابی پر وہ بہت شاد تھا۔ اس ملاقات کے موضوع کو مکمل کرتے ہوئے اس نے کہا تمہارا ادبی نام ہلال فاطمی ہوگا۔ وہ ہلال جس کی تابندگی اور درخشندگی سے آسمان ادب کا گوشہ منور اور روشن ہو جائے گا۔

محروم جھنجن پوری نے اپنی بات ختم کی تو دونوں مطمئن اور مسرور نظر آ رہے تھے۔ ماحول دوستانہ اور خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہلکی سی ضیافت کے بعد محروم اپنے کباڑ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ ہلال فاطمی کو اپنے ذوق طبعی کے اعتبار سے مفید موقع ملنے کی بے حد خوشی تھی۔ وہ محروم کو دور تک جاتے دیکھتے ہوئے اس انکشاف پر حیرت زدہ تھا کہ جوتے چپل کی طرح شاعر و ادیب بھی اصلی نقلی ہوتے ہیں۔

محروم جھنجن پوری اور ہلال فاطمی کے پارٹنر شپ میں غزل اور آواز کی تجارت نے بہت کم عرصہ میں ادبی منڈی میں اپنا قدم جما لیا۔ ہلال فاطمی کی شرکت مشاعروں کی جان اور کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے کلام کی اشاعت شہرت اور مقبولیت کا علم بلند کیے ہوئے فتوحات حاصل کر رہے تھے اور لکشمی ان کی گزرگاہیں پھولوں سے سجا رہی تھی۔ قسمت ان پر ٹوٹ کر مہربان تھی۔ کباڑ خانے پر کراہیت سے نگاہ دوڑاتے اور پان کی جگالی کرتے ہوئے ہلال فاطمی نے پوچھا۔

حضرت کباڑ خانے کی یہ مسموم فضا طبع نازک پر گراں نہیں گزرتی؟

آپ کا ذہن رسا بڑی تاخیر سے اس طرف متوجہ ہوا ہے، محروم شاعرانہ انداز میں فرمانے لگے۔ آپ جسے کباڑ خانہ کہتے ہیں وہ میرا نگار خانہ ہے۔ یہ پرانے اور ٹوٹے پھوٹے لوہے کے سامان شب تاریک میں اپنے اصل وجود میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور جب کائنات محو خواب ہوتی ہے وہ مجھے اپنی سرگزشت سناتے ہیں۔ نفرت اور محبت کے قصے اور فراق وصال کے افسانے سناتے ہیں گیسوؤں کی خوشبو، عنبریں ہونٹوں کا لمس، اور کنوارے دست نازک کی چوڑیوں کا ساز سنتا اور محسوس کرتا ہوں پھر وہ میری غزلوں اور گیتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ میرے خیال میں سارے شاعر و ادیب کباڑ خانوں میں شب بیداری کریں تو میری طرح ان کی بھی ہر تخلیق شاہکار ہو گی"۔ "بجا فرمایا حضرت" محترم کی طویل گفتگو کو ممیز کرتے ہوئے ہلال فاطمی نے کہا اس کی خودستائی گراں گزر رہی تھی۔ گفتگو میں خود کو شامل کرتے ہوئے پھر کہنے لگا محترم اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جائے کہ آپ کی تخلیق کو میری آواز سے عروج ملا۔"

"جناب آپ بھی فراموش نہ کریں کہ میری تخلیق نے آپ کو بلندیاں بخشی ہیں۔"

محروم یہ بات تو ماننا پڑے گا فاطمی اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے بولے، میری شخصیت، عزت اور شہرت سے متاثر ہو کر، آپ خود میری دہلیز پر تشریف فرما ہوئے تھے۔

بہت خوب، بہت خوب، محروم کے شاعرانہ اور نازک جذبات نے زبردست چوٹ محسوس کی۔ ہلال فاطمی نے ان کو پتھر مارا تھا جس طرح اس نے ادب کا دامن تار کیا تھا۔ ادب اور لحاظ کے زینے سے نیچے اتر آیا۔ اور چیخ پڑا، ”میرا احسان مانو کہ خاک پا کو آکاش کا تارا بنا دیا“، ”دونوں ہاتھوں تالی بجتی ہے بڑے میاں“، ہلال فاطمی بھی تاؤ میں آکر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ سے اداکاری کرتے ہوئے بولے۔ ”میرا احسان کم ہے کہ کباڑ خانے کی فرسودہ غزل کو اپنی خوبصورت آواز کی قلعی چڑھا کر بازار ادب میں قدر و قیمت بڑھا دی ہے بدصورت آدمی، ایک جملے میں تم کمینگی کی ساری حدوں سے گزر گئے اور اپنی اصلیت پر اتر آئے۔ اب باقی کیا رہ گیا۔ محروم کا وجود غصہ سے کانپ رہا تھا۔ انھوں نے خالی ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے نفرت سے کہا۔ ”ترک تعلق کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے میں اگریمنٹ پھاڑ کر پھینک رہا ہوں۔ تم دفع ہو جاؤ تم سے بہتر آواز پھر تلاش کر لوں گا۔“

تم بھی اپنی تخلیق کو کباڑ خانے کی زینت بناؤ بڈھے عاقبت کی فکر کئے بغیر ہلال فاطمی نے ایک اور گالی سے نوازتے ہوئے کہا مجھے بھی بازار معلوم ہے کتنے اسٹاکسٹ میری ناز برداری کے لئے چشم براہ ہیں، محروم کو چیلنج کرتے ہوئے وہ گیٹ سے باہر نکل گئے اور کباڑ خانے میں مصروف مزدوروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے گہرے دوست کس بات پر اتنی پستی میں اتر آئے تھے۔ یہ بڑے لوگ بھی ان ستاروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو آسمان کی بلندیوں پر چمکتے ہوئے کتنے اچھے اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور جب ٹوٹ کر گرتے ہیں تو غلاظت کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہلال فاطمی جوش میں بڑا تیر مار آئے تھے۔ مگر جب ہوش آیا تو ہوش بحال رکھنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ کئی مشاعروں میں شرکت کی دعوت آئی ہوئی تھی اور رسائل سے تخلیقات کے تقاضے تھے سب سے تازہ ترین تخلیقات کی فرمائش کی تھی ان کو کئی تاجر کی دکان کا پتہ معلوم تھا۔ لیکن برانڈ جانے سے زیادہ بھرم کھل جانے کا خطرہ درپیش تھا۔ فکر فردا میں وہ رات بھر اولین زچگی کے کرب میں مبتلا عورت کی طرح تڑپتے رہے تھے۔

کارگہہ حیات میں تن کر جینا محال ہے آہن سخت ٹوٹ جاتا ہے۔ جتنے عاقبت اندیش ہیں سب جھکتے ہیں۔ منسٹر بڑے منسٹر کے سامنے، افسر بڑے افسر کے سامنے اور شوہر بیوی کے سامنے جھکتے ہیں۔ درختوں میں پھل ہوتا ہے تو جھک کر اور خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ نرمی خاکساری اور معاف کر دینا اعلیٰ انسانی صفات ہیں۔ ہلال فاطمی اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے بے ارادہ کباڑ خانے کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے اور شاید انہیں خیالات سے اپنے دل کو بہلاتے ہوئے محروم چمن پوری سامنے سے چلے آرہے تھے۔ دونوں اشوک سنیما کے سائے میں اتنے پرخلوص انداز میں بغل گیر ہوئے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ محروم نے پہل کرتے ہوئے کہا ”شاید کل جذبات میں غیر معیاری کلام ادا ہو گئے تھے“، مجھے تو یاد نہیں آرہا،” ہلال فاطمی نے یادداشت پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ ”شاید میرے کلمات آپ کے شایان شان نہ تھے۔“

چھوڑے بھی فاطمی صاحب یاد ماضی عذاب ہوتا ہے، محروم نے اسے ہوٹل کی طرف کھینچتے ہوئے خالص شاعرانہ انداز میں کہا۔ اگر انسان کی یادداشت کمزور ہو جائے تو زندگی کتنی حسین...... کتنی حسین ہوگی، اشوک سنیما نے کتنے ہی عظیم فنکاروں کی اداکاری کا مظاہرہ دیکھا ہوگا۔ مگر ان دونوں فنکار کی اداکاری پر پہلی بار انگشت بدنداں تھا۔

☆☆

مجھے امیدواروں سے بچاؤ

سنا ہے کہ سرکاری رقمیں دلی سے اب سیدھے پنچایت میں آیا کریں گی اور مکھیا کو خود چیک کاٹنے کا پاور ملے گا۔ دوسرے معنوں میں وہ بلاشرکت غیرے پنچایت میں سیاہ و سفید کا مالک ہوگا۔ اس خوابناک اور طربناک تصور نے لوگوں کو جنون میں مبتلا کردیا ہے۔ بلاتمیز اہل اور نااہل ہی نہیں بلکہ مسخرے امیدواروں کی بھرمار ہے۔ جو وارڈ ممبر کے لائق نہ تھے وہ مکھیا بننے کا سپنا ڈھوتے پھر رہے ہیں اور مکھیا کے قابل نہ تھے وہ پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کی اونچی کرسیوں پر پہنچنے کے لئے چھلانگ لگا رہے ہیں۔ امیدواروں کی بھرمار ہے جو گرد اڑاتے اور دھول پھانکتے پھر رہے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ تو دیوانے ہیں اور کچھ کو دیوانون نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ وہ یوں کہ چالاک امیدواروں نے اپنے مخالف کے کسی خاندان سے احمق کو ووٹ کاٹنے کے لئے کھڑا کردیا ہے۔ ایک عہدہ پر ایک درجن سے زائد امیدواروں کی طرح اسے بھی پورا یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ کوئی اس بھرم میں کیوں نہ مبتلا ہوگا جب کوئی ووٹر کسی کو مایوس نہیں کرتا ہے۔

ایک مکھیا کا امیدوار اس خوش آئند تصور میں ڈوبا ہوا تھا کہ کامیابی کے بعد کیسے چیک کاٹے گا اور پنچایت میں متعین سرکاری عملوں کی تنخواہوں سے کس طرح کمیشن وصول کرے گا کہ اچانک اس کی بیوی نے چیخ چیخ کر اس کا خواب چکنا چور کردیا۔ میں اس کے گھر کے نزدیک سے گزر رہا تھا۔ عورت کے چلانے کی آواز سن کر ٹھہر گیا۔ وہ غصہ میں کہہ رہی تھی۔ ہو اللہ ایسا نکما مرد میرے ہی قسمت میں لکھ دیا۔ جو بھی دو چار کھنڈ کھیت بچا تھا اسے

بیچ کر کچھ دن بال بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ مگر یہ مرد مکھیا میں کھڑا ہو کر اسے بھی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ایسے تاری پانی میں زندگی برباد کرنے والے کو کون پاگل ووٹ دے گا؟

''یہی حرامزادی کی حرامزادی ہم کو ہرائے گی'' مکھیا کا امیدوار بیوی پر گرجا تو اس کی بوڑھی ماں بھی خاموش نہ رہ سکی ''ہاں ہاں تجھے کون پاگل ووٹ دے گا۔ تو بھی جیتنے کا سپنا دیکھ رہا ہے؟ گاؤں کے لوگ جانتے ہیں کہ تو نے زندگی بھر ماں کو ستایا۔ بیوی بچوں کو تکلیف دیا اور بابا دادا کی جائداد بیچ کر تاڑی پی گیا۔ اگر تیرے جیسا مکھیا ہو گیا تو سارے گاؤں کو بیچ کر تاڑی پی جائے گا تو کیا جیتے گا تجھے تو جورو بھی ووٹ نہ دے گی۔''

''موقع ہے جو جی میں آئے بول مگر مکھیا بننے کے بعد دونوں کا سوئی دھاگا سے منہ نہ سی دیا تو میرے جیسا حرامی بھی کوئی نہ ہوگا۔''

اس کی فطرت سے میں واقف ہوں۔ الیکشن کا نازک موقع نہ ہوتا تو وہ دونوں کی روئی کی طرح دھنائی کر کے رکھ دیتا مگر ابھی بات بڑھ جانے سے فیلڈ خراب ہونے کا اندیشہ تھا وہ دونوں کے حرامی پن کو نظر انداز کرتا ہوا ورک کرنے کے لیے چل دیا۔ اسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ کر میں بھی بڑھ چلا تھا مگر اس نے نظر پڑتے تپاک سے سلام کیا۔ خیریت دریافت کرنے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا ''آپ کی دعا سے پوزیشن بہت اچھی ہے ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔''

گاؤں میں داخل ہوا تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا جگہ جگہ بینر لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر رنگ رنگ کے پوسٹر چپکے ہوئے تھے۔ اس خیال سے میرے ہونٹوں مسکرا اٹھے کہ شادی کے برسوں بعد میری آمد پر گاؤں کو میرے استقلال کے لئے خوب سجایا گیا ہے چوک پر خلاف معمول صاف ستھرے لباسوں میں ملبوس افراد کی بھیڑ تھی۔ امیدواروں نے اپنے خاص لوگوں کو شہر سے بلوایا تھا جس سے لگتا تھا کہ گاؤں میں تفریح کے لئے شہر آ گیا ہے امیدواروں نے عبداللہ کیپ چڑھا رکھا تھا اور وہ اپنی تعداد کی بہتات کی وجہ سے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ سلاموں کی بارش ہو رہی تھی اور مصافحوں سے ہاتھ چھلے جاتے تھے۔ لوگوں میں اتنا والہانہ خلوص اور محبت میں وارفتگی جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے کبھی عید کے

موقع پر بھی ایسا سماں نہیں دیکھا تھا۔

میرا بھی والہانہ استقبال ہوا۔ سب بغلگیر ہوتے ہوئے بڑے یقین سے کہتے ”خدا کی قسم میری پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ انشاءاللہ مجھے کامیابی ضرور ملے گی، ذرا آپ صرف اپنے سسرال والوں سے کہہ دیں گے ویسے ان کی حمایت مجھے حاصل ہے۔“

”آپ یقین کریں آپ کی یہ معمولی سی خدمت میں ضرور کروں گا۔“

تمام امیدواروں نے اپنی کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے ایک ہی بات دہرائی تھی۔ لہٰذا میں بھی انہیں مایوس کرنے کی بجائے اپنی خدمت کا یقین دلاتے ہوئے منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کرتا ہوا بڑی مشکلوں سے اپنی سسرال تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

دراصل شہر کی مصروفیتوں سے اکتا کر سسرال کا لطف اٹھانے، آرام سے جی بھر کے سونے اور سکوں سے چند دن گزارنے کے لئے سسرال جانے کا فیصلہ بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں طوفان برپا ہے۔ جس نے لوگوں کا سکھ، سکون اور آرام حرام کر رکھا ہے۔ بلائے ناگہانی کی طرح شب و روز امیدوار تعاقب کرتے رہتے ہیں اور لوگ ان سے پیچھا چھڑاتے اور جان بچاتے پھر رہے ہیں۔

حویلی پر سناٹا مسلط تھا۔ جہاں میرے انتظار میں آنکھیں بچھی ہوئی رہتی تھیں۔ وہاں نہ کوئی آدم تھا اور نہ کوئی آدم زاد خدا جانے کیسی آفت ناگہانی آگئی تھی۔ جو ہرے بھرے والان میں خاک اڑ رہی تھی۔ کسی انجانے خوف سے میرا دل کانپنے لگا۔ قریب پہنچا تو جلی حرفوں میں ہاتھ سے لکھا ہوا بورڈ نظر آیا ”صاحب خانہ گھر پر موجود نہیں“ ہیں۔ خورشید دروازہ کھولو خورشید دروازہ کھولو خورشید دروازہ کھولو!

میں نے عجلت میں دروازہ پیٹنے کے ساتھ آواز بھی لگائی مگر بہت کوشش کے باوجود کوئی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میری آواز پر اور بھی خاموشی ہوگئی تھی۔ مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا نام لے کر پکارا۔ میں نیاز ہوں، خورشید دروازہ کھولو!

میری ترکیب کھل جا سم سم کا منتر ثابت ہوئی دروازہ کھول کر خورشید نے سلام کے

بعد ادھر ادھر جھانک کر اطمینان کر لیا کہ دوسرے لوگ تو نہیں ہیں پھر مجھے ساتھ لے کر حویلی میں آیا۔ میں اس کی حرکت پر ششدر، حیران اور بھونچکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس سے خوف زدہ ہے اور یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ آپ لوگوں نے کیوں اس گھر کی ایسی حالت بنا رکھی آخر ہوا کیا ہے؟

دھم دھم کی آواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے سامنے تفصیل سے اپنی حالت خستہ بتائی۔ کوئی امیدوار دروازہ پیٹ رہا ہے۔ وہ تھک ہار کر چلا جائے گا اور پھر دوسرا چلا آئے گا یہ سلسلہ رات دن چلتا رہے گا بھائی صاحب پنچایت کے امیدواروں نے عذاب کی طرح دن کا سکون اور راتوں کی نیند حرام کر رکھا ہے۔ ایک جاتا ہے اور دوسرا آ دھمکتا ہے۔ زلزلوں کے جھٹکوں کی طرح امیدواروں کی آمد پر دھیان لگا رہتا ہے۔ صرف مکھیا کے اٹھارہ امیدوار ہیں۔ تمام عہدوں پر قابض ہونے کے لئے بھٹکنے والوں کی تعداد سو کے قریب ہو جائے گی۔ ایک کی حمایت کیجئے اور بقیہ کو دشمن بنا لیجئے اور زندگی بھر نا کردہ گناہوں کی سزا کے لئے تیار رہئے۔ یہ ایسی مصیبت ہے جس سے نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ ابا کی عدم موجودگی کا بورڈ لگا ہے مگر خود غرض امیدواروں کو صرف اپنا چھاپ ہی نظر آتا ہے تمام احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی پریشان کرنے آتا رہتا ہے۔ دروازے کی سلامتی اور بد اخلاقی کے الزام سے محفوظ رہنے کے لئے لڑکوں میں ڈیوٹی بانٹ دی گئی ہے جو پوچھنے والوں کو بتا دیتے ہیں کہ ابو جان گھر پر نہیں ہیں۔

''ابو جان آخر کہاں ہیں؟''

''وہ تنگ آ کر روپوش ہو کر رہ گئے ہیں میرے سالا نے انتہائی دکھ کے ساتھ کہا۔ وہ عشا کے بعد گھر آتے ہیں اور فجر کے بعد آم کے باغ میں کٹیا بنی ہے وہیں پڑے رہتے ہیں امیدوار اپنے حریفوں کے مقابل ہیں اور ہم لوگ سارے امیدواروں کے ہدف بنے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے گھروں میں نظر بند ہو کر رہ گئے ہیں۔

بڑی آرزو لے کر میں سسرال آیا تھا مگر سارے ارمانوں پر پانی پھر گیا تھا۔ حویلی کے آفت زدہ ماحول نے طبیعت مکدر کر کے رکھ دیا تھا۔ ابو جن سے ملنا ضروری تھا مگر ان کی

روپوشی کا راز کھل جانے کا خطرہ تھا امیدوار لوگوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لہذا منع کرنے کے باوجود دل بہلانے کی غرض سے چوک کی طرف نکل گیا۔ ایک آدمی ہاتھ میں مٹی کا ڈھیلا لئے لڑکوں کو کھدیر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ امیدوار ہے اور اس کا چناؤ نشان بیگن ہے جیسے لڑکے چڑھانے کے لئے گا رہے ہیں۔ تیرے بغیر بیگن سالن مزا نہ دے گا۔

یہ بڑا ہی دلچسپ اور دیدہ زیب منظر تھا۔ سب لوگ خوش اخلاق اور خوش گفتار ہیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کون جیتے گا معاملہ مستقبل کی کوکھ میں محفوظ تھا۔ مگر سارے امیدواروں کو ووٹرون نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ کامیاب ہو رہا ہے۔ لہذا سب ملنے والوں سے بغلگیر ہو کر ایک زبان سے یہ جملہ کہتے تھے کہ انشاءاللہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

سسرال میں ذرا بن سنور کر رہا جاتا ہے۔ لہذا جوتا پر پالش کرانے کا خیال آیا تو معلوم ہوا کہ منگو رام مکھیا کا امیدوار ہے۔ داڑھی صاف کرانے بڑھا تو پتہ چلا کہ جوگی ٹھاکر پنچایت سمیتی میں اور اس کا پڑوسی لطیف صافی ضلع پریشد کی ممبری کے لئے علاقے کی خاک چھان رہا ہے۔ پھر خیال آیا اگر یہ لوگ مل جاتے تو دوسرے امیدواروں کی طرح خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہی کہتے کہ میری پوزیشن بہت اچھی ہے ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

تھوڑی تھوڑی دیر پر دروازہ پیٹنے اور آواز لگانے کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم لوگ حویلی کے اندرونی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اباجی آچکے تھے اور دل گرفتہ سے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہہ رہے تھے معقول اور اہل افراد کے درمیان انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ایسے نامعقول لوگ دم ہلاتے پھر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے امیدوار کا جیسے سیلاب آگیا ہے۔ کسی سے کوئی کیا بات کرے؟ آخری زمانے کی نشانیاں ابھر کر سامنے آگئی ہیں۔ ہم جیسے لوگ اس طوفان بدتمیزی سے کنارہ کش رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اس رات دروازہ پیٹنے صدا لگانے والوں اور ابوجی باہر گئے ہوئے ہیں کی آوازوں نے سونے نہ دیا رات کا پچھلا پہر رہا ہوگا۔ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ بیدار تھا۔ میرے کمرے کے بیرونی دروازہ کے باہر نسوانی گفتگو اور مترنم قہقہے رات کے سناٹے میں

مٹھاس گھول رہے تھے۔ اتنی رات گئے یہ عورتیں کہاں سے آئی ہیں؟ اور آدم زادیاں ہیں کہ پریوں کا قافلہ بھٹک کر آ گیا ہے؟ میں انھیں خیالوں میں غلطاں تھا کہ زنجیر کے سنگیت کے ساتھ مترنم نسوانی آواز سماعت میں رس گھولنے لگی۔ سسرال کی فضا میں تو آدمی رومانٹک ہو ہی جاتا ہے اور یہ موقع ایسا تھا جس کی تمنا کی جاتی ہے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ ان کی ایک ہستی ہی ہوش خرد سے بیگانہ بنا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے اور وہاں ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں اپنے چہروں پر مسکراہٹ سجائے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک عورت نے لالٹین کی روشنی ایک خوبصورت چہرہ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”شکیلہ خاتون پنچایت سمیتی کی مضبوط امیدوار ہیں۔ کچھ جاہل اور گنوار قسم کی دوسری امیدوار بھی کھڑی ہیں مگر ان کا کسی سے مقابلہ ہی نہیں ہے اگر یہ کامیاب ہو گئیں تو بلوک میں گاؤں کا مقام اونچا ہوگا اور ترقی کے بہت سے کام ہوں گے۔ مہربانی کر کے اپنے سسرال والوں کو آپ بھی کہہ دیں۔

”یقیناً ان کی کامیابی سے گاؤں سماج اور خاندان کا نام روشن ہوگا“ میں نے عورت ہونے کے ناطے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سب لوگ ان کی حمایت کر ہی رہے ہیں پھر بھی بطور خاص ان سے کہوں گا آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی وہ شکریوں اور سلاموں کے پھول پھینکتی ہوئی چلی گئیں۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ ایسے حالات میں سکون کے لئے یہاں کیوں چلا آیا اور ایک منٹ کے آدھے حصے میں فیصلہ کر لیا کہ سکون کی خاطر کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سلامتی کا صرف یہی راستہ ہے۔

میں نے ابو سے اجازت لینے کے لئے ان کے کمرے کا دروازہ کھلوایا۔ وہ پہلے سے ہی بیدار اور آم کے باغ میں جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ تجرد، تنہائی اور تکلیف دہ وقت بہت مشکل سے گزار رہے تھے میری واپسی کا ارادہ معلوم ہوتے ہی باغ میں جانے کے بجائے میرے ساتھ شہر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولے ”یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا تھا ایمان اور عزت بچانے کا اس سے بہتر طریقہ دوسرا نہیں۔“

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے ابو جی نے حسرت سے حویلی پر نگاہ ڈالی اور اپنے دل کی کیفیت اپنے دل میں چھپائے میرا ہاتھ تھام کر چل پڑے اور میں نے وزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ اماں کوار کا پٹ تھامے کھڑی ہوئی ہمیں دکھ کے ساتھ جاتے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا ان کی خاموش نگاہیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس حال میں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو۔

☆☆

ایک پاؤں کا جوتا

لوگ جمنی کے آنگن میں حیرت زدہ مبہوت اور خاموش کھڑے تھے۔ ان کی طاقت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس طرح حلقہ باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ جیسے کسی عزیز کے اچانک مرجانے پر نعش کے اطراف جمع ہوئے ہوں اور ان کی نگاہیں درمیان میں پڑے ہوئے ایک پاؤں کے جوتے پر مرکوز تھیں وہ صرف ایک جوتا نہ تھا بلکہ یقین و اعتماد کی بے گور و کفن لاش تھی۔ بدصورت، بدہیت، کریہہ اور ننگی لاش!

ان کے ذہنوں میں بگولے اٹھ رہے تھے اور وہ خود اپنے دلوں سے پوچھ رہے تھے کیا دھرم اور ایمان کی باتیں صرف کتابوں کی زینت اور معصوم افراد کو دھوکا دینے کے لئے رہ گئیں ہیں کسی کو اب خدا کے قانون کا خوف نہیں ہے؟ بلکہ خوبصورتی خوشبوؤں اور محبتوں کے بیکراں ساگر کا جھوٹا خوف دلا کر دھوکا دینے والے بے شمار پیدا ہو گئے ہیں؟ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اس کا اصلی روپ اتنا بھیانک مکروہ اور اذیت ناک ہوگا۔

ان کے جذبات کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان کے سینوں کو مسلسل کچل رہا ہے برداشت کی حد جواب دے گئی ضبط کا بندھن آخر ٹوٹا اور خامشی ابل پڑی۔

سارے پاپ کی جڑ حرامزادی جمنی ہے اس نے کتنے کو خراب کر دیا ہے اگر اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوگی تو ایک دن پورا گاؤں برباد ہو کر رہ جائے گا، شریفوں اور عزت داروں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دے گی۔ سب کی رائے ہو تو چوٹی کاٹ کر ماں بیٹی کو گاؤں سے بھگا دینا چاہیے۔"

جو لوگ جمنی کی ایک نگاہ التفات کے لئے ترستے تھے۔ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جنہوں نے اپنے آنگن میں اس کے جانے پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ وہ اس کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ اسے مٹانے اور گاؤں سے بھگانے کی باتیں کرر ہے تھے۔ ایسی باتیں کتنی بار ہوتی رہیں ہیں مگر ان پر عمل کب ہوا ہے؟ من کے چوروں کی کثرت ہے۔ ہر بار صرف اس بات پر اتفاق ہوتا ہے کہ حرامزادی اپنے کرتوت سے صرف گاؤں میں بدنام ہے۔ اگر اسے بھگا دیا تو دور تک گاؤں بھی بدنام ہو جائے گا۔

لوگوں کے خوف سے جمنی اپنی بیوہ ماں کے ساتھ کمرے میں بند تھی وہ ایسے کٹھن دور سے کئی بار گزر چکی تھی۔ اسے اپنے انجام کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ وہ کوار کے شگاف سے اپنے آنگن میں ایک پاؤں کے جوتا پر نظر جمائے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کی باتیں بھی سن رہی تھی۔ وہ کس کی عزت اور شرافت کے حفاظت کی باتیں کرر ہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو محسوس ہو رہا تھا جیسے سب ایک ساتھ اس کی بارگاہ میں سرنیاز خم کر کے خراج پیش کرر ہے ہوں اور وہ ان سب سے کہہ رہی ہے۔

تم سب عزت، شرافت اور شرم وحیا کے نہ جانے کتنے پردوں میں خود کو چھپائے ہوئے ہو صرف دوسروں کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی فریب دینے کے عادی ہو چکے ہو۔ جتنے قانون ضابطے اور اصول ہیں۔ دوسروں پر عائد کرنا چاہتے ہو۔ لیکن خود کو اس سے میرا اور آزاد سمجھتے ہو جب کوئی دوسرا تم سے فریب کرتا ہے تو چیخ اٹھتے ہو۔ کسوٹیوں پر پرکھتے ہو۔ ذلیل کرتے ہو قید خانوں میں ڈالتے ہو اور سولی پر چڑھانے میں ذرا بھی رحم نہیں آتا ہے۔ ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھو کہ تم خود کیا ہو، بے ایمان، مفاد پرست اور بے شرم!

وہ ایک بیوہ ماں کی بیٹی تھی۔ بیٹیاں تو پورے گاؤں اور سماج کی ہوتی ہیں۔ مگر اسے بیٹی کیوں نہیں سمجھا گیا؟ کسی نے اسے اپنی بہو کیوں نہیں بنایا؟ ایک بے بس اور بے سہارا کو جمنی کا یہ روپ کس نے دیا ہے؟ گاؤں کے پاکیزہ ماحول کو کس نے زہر آلود کیا ہے؟ وہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دینا چاہتی تھی مگر اس کی سنتا کون؟ وہ تو صرف حرامزادی جمنی تھی بے بس، بے سہارا بدچلن!

جمنی تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔

تمہاری بات اور ضرورت سب جانتی ہوں کالے کلوٹے آئینہ دیکھ لینا۔

قسم لے لو میری نیت خراب نہیں ہے میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

جمنی تم جیسے عربین کے جال میں پھنسنے والی نہیں ہے۔ عرب لے جا کر کسی عربی کزورچی کے ہاتھوں بیچ دو گے۔ نہیں تو دس دن موج مستی کر کے خود چل دو گے اور میں برسوں ہاجرہ باجی کی طرح چپکے چپکے آنسو بہایا کروں گی۔ کسی اور بدنصیب کا گھر دیکھو جمنی چلی۔

”جمنی میں نے تم سے کچھ کہا تھا وہ بھول گئی؟“

”ہزار بار کہہ دیا کہ جمنی کلکتیا اور بمبیا کے چکر میں نہیں آئے گی۔ خود تو شہروں میں رنگ رلیا مناتا ہے اور برسوں عورت بچوں کو تڑپاتا ہے میں تو شادی کروں گی اس گاؤں کے کسان سے، ہلواہا سے...... چرواہے سے...... جو دکھ میں سکھ میں ہر دم ساتھ رہے گا۔

”جمنی آج کل ہم سے ناراض لگتی ہے“ کوئی آہیں بھرتا ہے۔ جمنی کسی سے ناراض نہیں ہوتی ہے۔ اس کے قدم ٹھہر جاتے اور نہ کسی کو ناراض کرتی ہے“ وہ وہم میں مبتلا ہو کر خوشی سے کہتا۔ چل کسی ملا سے نکاح پڑھوا لیں۔

میں تو راضی ہوں وہ بھی لطف لیتے ہوئے ذرا ٹھہر کر کہتی مگر ابھی میری مرضی نہیں ہے۔

وہ اپنے بسمل کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر کسی کے آنگن میں گم ہو جاتی۔ وہ ایک ایسا...... شہد آگیں ثمر تھی۔ جس کی تمنا میں دیوانے تو دیوانے تھے۔ جو لوگ ایک اجنبی دنیا میں جانے کی تیاری کیے ہوئے تھے وہ بھی اسے دیکھ کر بیتے دنوں کے واپس لوٹ آنے کی آرزو کرتے تھے۔ جب یہ عالم ہو اور کسی کے قدم لڑکھڑا جائیں تو اس کا کیا قصور؟

سپنوں کے گاؤں کی ساری معصومیت، محبت اور پاکیزگی سیلاب میں بہہ کر اندھیرے سمندروں میں گم ہو چکی ہے دھرتی کی کوکھ بانجھ بن گئی ہے۔ اور کھانے والے بڑھتے جا رہے ہیں۔ دنیا کے سب کارخانے بند ہو سکتے ہیں مگر جنم کی چکی رک نہیں سکتی۔ پاپی پیٹ نے آدمی کو آدمی کے جنگلوں میں خاک نوردی پر مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ کسے تمنا نہیں کہ اپنے لاڈلے کو

سینے پر لٹا کر خود بھی سکون کی گہری نیند میں ڈوب جائیں۔ اب اجڑے دیار میں وہی لوگ بستے ہیں جو وہاں رہنے پر مجبور ہیں بے کار، بے اثر، کچھ کسان اور کچھ مزدور۔

اب تو گاؤں کی سہانی یادیں اذیت ناک معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی وہاں سرغنہ، سردار اور سرپرست ہوا کرتے تھے جو تسبیح کے دانوں کی طرح سب کو ایک دھاگے میں پرو کر رکھتے تھے۔ سب کی عزت قدر اور تیاگ کا جذبہ زندگی کا حصہ ہوا کرتا تھا مگر اب وہ خوبصورتی خواب و خیال ہو چکی ہے۔ پھر کون جمنی کے پاؤں میں بیڑی ڈالتا اور اسے چہار دیواری میں بند کر کے کہتا کہ تو گاؤں کی بیٹی ہے۔ ہم سب کی عزت ہے اور ہم تیری آرزو پوری کریں گے۔

کبھی کہیں ایسا ہوا تھا کہ جو پہلا مسافر شہر میں داخل ہوا تو اسے تاج پہنا کر بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا ٹھیک اسی طرح مستان صاحب گاؤں میں آئے۔ گٹھا ہوا لمبا قد، کالی تہبند سر پر صافہ، جسم پر قبا اور ہاتھ میں عصا تھامے ہوئے بڑی بڑی مسحور کن شب بیداری سے سرخ آنکھیں وہ جس طرف اٹھ جاتیں لوگ سحر زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔ وہ شکور کی بیٹی کو جنات کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے بلائے گئے تھے۔ مگر چند دنوں میں ہی ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا نجات دہندہ بنا لیا گاؤں کے لوگوں نے مستان صاحب کی آمد کو غیبی امداد اور خوش بختی سے تعبیر کیا تھا ان کے قیام کے لئے ایک الگ تھلگ کمرہ مخصوص کر دیا تھا۔ جہاں وہ عبادت و ریاضت کے ساتھ رہنمائی کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔ ان کے حجرے پر مجلسیں ہوا کرتیں جس میں دینی دنیائی باتیں ہوا کرتی تھیں بوڑھے۔ عاقبت سنوارنے آئے اور عورتیں اپنے پردیسی کی سلامتی اور جلد گھر آ جانے کے لئے دعا کرانے اور تعویذ لینے ان کے حجرے پر بھیڑ لگائے رہتی تھیں۔

مستان صاحب نے گاؤں کی حالت پر نظر دوڑائی تو انہیں خرابی ہی خرابی دکھائی دی۔ پھر انہوں نے اصلاح پر توجہ دی اور تاری کی دکان پر تالے پڑ گئے۔ کھلے عام تاش کھیلنے پر پابندی عائد کر دی گئی اور بلا ضرورت چائے کی دکانوں پر بیٹھ کر وقت برباد کرنے کو بھی ختم کر دیا گیا۔ جب سدھار کی بات ہو تو جمنی مستان صاحب کی نظر سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی لیکن جب جمنی پر پابندی لگائی گئی تو اس نے بہت نرمی سے کہا تھا۔ میرے گھر میں دوسروں

کے جانے پر بھی روک لگا دیجئے۔"

"تو ضروری کام کے بغیر گھر سے باہر نکلے گی یا جو بھی کوئی تیرے گھر جائے گا اسے سخت سزا دی جائے گی۔

مستان صاحب نے اپنے احکام کی پابندی کا سب سے عہد کر رکھا تھا۔ پھر کس کی مجال تھی جو ان کے حکم سے سرتابی کر سکتا تھا۔ لوگوں کو ان کی سحربار آنکھیں ہر وقت پر تعاقب کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں گاؤں کا ماحول یکسر بدل کر رہ گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت سے پہلے عبادت کا مہینہ آ گیا ہے۔

جمنی کی ماں نے صرف دو بار مستان صاحب کے حجرے میں حاضری دی تھی وہ تعویذ لینے آئی تھی۔ جمنی کو ڈراؤنے خواب ستانے لگے۔ وہ مستان صاحب کے حکم پر پابندی سے عمل کر رہی تھی۔ دوسروں کا جانے کیا حال تھا مگر اس کے لئے بڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ اس پر جو بیت رہا تھا اس کا اسے احساس تھا مگر وہ اس بات کی منتظر تھی کہ دوسرے لوگ کب تک برداشت کرتے ہیں کیونکہ دلون کے معاملے دیواروں سے روکے نہیں جا سکتے۔

گویا انار کلی قید کر دی گئی تھی اس پر پہرے بٹھا دئے گئے تھے اور چھپ چھپ کر اس کے گھر کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ پہریدار جمنی کے گھر کے بجائے ایک دوسرے کی نگرانی کر رہے تھے۔ خود ان کے دلوں میں پاپ چھپا ہوا تھا وہ تاک میں تھے مگر کسی کو موقع نہیں مل رہا تھا۔ نگرانی کرنے والوں کے علاوہ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مستان صاحب کی آنکھیں اندھیرے میں بھی انہیں دیکھ رہی ہیں۔

وہ رات کا پچھلا پہر رہا ہوگا جب اطراف سے شور بلند ہو رہا تھا اتنا شور کہ سارا گاؤں بیدار ہو کر آواز کی سمت دوڑنے لگا تھا۔ سب کو احساس تھا کہ چور کہاں ہو سکتا ہے۔ جمنی کے آنگن میں پہنچتے ہی جیسے ان کے قدم زمین سے چپک جاتے اور حیرت سے نگاہیں پھیل جاتیں اور ان کے ذہنوں پر مسلسل ضرب پڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سب لوگ حصار باندھے اور سوگ میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے اور ان کے درمیان میں ایک پاؤں کا جوتا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس قطرے کی طرح جو بہت سارے پانی

کو ناپاک کر دیتا ہے۔

ان میں سے ایک معمر شخص آہستہ سے آگے بڑھا اور جوتا ہاتھ میں لے کر باہر کی طرف چلنے لگا اور سب کے سب سوگوار، خاموش اور سر جھکائے ہوئے اس کے پیچھے ...... چل پڑے جیسے جنازہ کے ساتھ قبرستان جا رہے ہوں۔ اس شخص نے ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر اپنے ہاتھ کا جوتا بھی اس جگہ رکھ دیا جہاں دوسرے پاؤں کا جوتا پڑا ہوا تھا۔ جیسے قبر میں لاش رکھ کر باہر آتے ہیں وہ حزن و ملال میں ڈوبا ہوا چہرہ لئے باہر نکلا مستان کے حجرے کی زنجیر چڑھا کر گھر کی طرف چلنے لگا اور سب لوگ اس کی تقلید کرتے ہوئے یوں چلے جا رہے تھے۔ جیسے کسی عزیز کی میت کو دفن کر کے قبرستان سے واپس لوٹ رہے ہوں۔ غموں سے نڈھال اور رنج و الم سے بے حال اس روز جمنی اس طرح گاؤں کی طرف جا رہی تھی جیسے کوئی فاتح شہر پناہ کی سیر کرنے اپنے قلعے سے نکلتا ہے۔ شاداں، نازاں اور بے پرواہ!

☆☆

ہمارا احترام کرو

موسم کا مزاج چاہے جیسا بھی نیلا، پیلا اور ہرا رنگ بدلے حافظ زین الحق کے معمول میں رخنہ نہیں ڈال سکتا۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد گاؤں کے مختلف راستوں سے مخصوص دوہا گاتے ہوئے گزرنا ان کے معمولات میں شامل ہے۔

جب سرمئی اندھیرے ریشمی اجالوں سے گلے مل کر جدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ پُرکیف...... شوخ کلیوں کو گدگداتے ہوئے محوِ خرام ہوتی ہے اور پرندوں کی دل پذیر آوازیں سنگیت کی لے گھولتی رہتی ہیں۔ ایسے حسین روح پرور اور حیات بخش ملحات میں حافظ زین الحق لحات کی پاکیزہ شبنم میں ڈھلی ہوئی پرسوز آواز میں گاتے ہوئے گزرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ان کی روح الاپ کر رہی ہو۔

کنکر چن چن محل بنایا لوگ کہے گھر میرا
بھور بھئی جاگ مسافر دنیا رین بسیرا

امجد علی کا شمار گاؤں کے متمول افراد میں ہوتا ہے مال و زر کے رکھوالے تو اور بھی ہیں۔ لیکن امجد علی کی بات کچھ اور ہی ہے اگر زندگی نے ان کو نوازا ہے تو اپنے احباب کی نوازش میں بخالت کو وہ بھی قریب بھٹکنے نہیں دیتے۔ بیرون ملک اور راجدھانی میں زندگی گزارنے کے بعد آخری ایام آبائی بستی میں گزار رہے ہیں۔ دل بستگی کے لئے اپنے ہم عصروں کی جیسے ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ جو نماز فجر کے بعد اپنے مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور امجد علی صبح کی چائے سے ان کی تواضع کرتے ہیں۔

امجد علی کی حویلی کے سامنے بہار سرکار کی زمین پر نیم کا ایک پرانا درخت ہے۔

اس کے سائے میں چند سال خوردہ کرسیاں اور سن رسیدہ چوکیاں موسموں کی افتاد سے بے پرواہ پڑی رہتی ہیں۔ ان پر جب کوئی بوڑھا نقاہت سے کراہتے ہوئے بیٹھتا ہے تو ان کے بوجھ کی تکلیف سے کرسیوں کی بھی آہیں نکل جاتی ہیں۔ لوگ ان کی دردناک کراہوں کی پرواہ کیے بغیر خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے حکومت عوام کی شکایت اور مشکلات کے احتجاج پر دوسرا الیکشن آنے سے پہلے دھیان نہیں دیتی ہے۔

صبح کا سہانا وقت امجد علی کے احباب کے لئے وقف ہے۔ اگرچہ ان کے حالات الگ الگ اور وہ مختلف امراض میں مبتلا ہیں مگر زمانے کی بے اعتنائی، بے پروائی ان کا مشترکہ غم ہے۔ یہی ایک جگہ ہے جہاں انہیں دل کھول کر دل کی باتیں کہنے کا موقع ملتا ہے ورنہ کون سنتا ہے فغانِ درویش!

حافظ زین الحق دنیا سے بے خبر ہونے والوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے جس وقت بوڑھوں کے مرکز پر پہنچے وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ سلام کے بعد اپنے مخصوص مقام پر بیٹھتے ہوئے اطمینان ظاہر کیا۔ ”غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔“

”بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں“ طنزیہ انداز میں اپنے بہنوئی نسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مظاہر نے مصرع مکمل کر دیا۔ نسیم نے خوش مزاجی کا مظاہر کرتے ہوئے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ تم کو رخصت کرنے کے بعد ہی میں جاؤں گا۔ ورنہ وہاں میری خدمت کون کرے گا ہم تو تمہارے بغیر جنت میں جانا بھی پسند نہیں کریں گے۔“

”جنت، جہنم اور موت کے علاوہ ہم بوڑھوں کے سامنے کوئی اور موضوع گفتگو نہیں ہے؟ ماسٹر کے مزاج کے بعد قہقہوں کی کھر دارہٹ کا شور تھا تو عبدالسلام نے بیزاری کا اظہار کرتے اور ماضی کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دل کا درد زبان سے ادا کیا۔ کبھی تصورِ جاناں کی بستیاں تھیں۔ کیف انگیز اور قہقہہ ریز موضوع ہوا کرتے تھے مگر اب بیماریوں کی تکالیف کا تذکرہ، زمانے بھر کا شکوہ اور موت کا تصور ہی ہم بوڑھوں کے لئے رہ گیا ہے۔ کبھی ہمیں دیکھنے والے رشک کیا کرتے تھے۔ لیکن اس بڑھاپے میں غیروں پر الزام کیوں دھریں ہمیں اپنے بھی اس انداز سے دیکھتے ہیں کہ موصوف کب تک عدم آباد سدھارنے

والے ہیں۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔”

”بڑے تلخ حقائق کی طرف تم نے نشاندہی کی ہے“ عبداللہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ واقعی ہمیں اپنی نجات کی فکر اور ہمارے پرسان حال کو ہمارے بوجھ سے نجات کی فکر لگی رہتی ہے۔ کل میں وحید کی عیادت کو گیا تھا۔ موت میں تاخیر کے باعث اقربا سخت بیزار ہیں اور اپنے نقصانات کا اندازہ لگاتے ہوئے شکوہ کناں ہیں۔ کیا ستم ہے کہ جن کی خوشی کے لئے وحید نے زندگی بھر جدوجہد کی ہے۔ وہی لوگ اس کے مرنے کی دعا مانگ رہے ہیں۔

کسی نے درست فرمایا ہے کون ہوتا ہے برے وقت کی حالت کا شریک، مرتے دم آنکھوں کو دیکھا ہے کہ پھر جاتی ہے اور تجربہ کار یہ بھی ٹھیک کہتے ہیں کہ ایک باپ دس بچوں کی پرورش کرتے ہوئے روحانی مسرت محسوس کرتا ہے۔ لیکن دس بچے ایک باپ کے بوجھ کو مصیبت سمجھتے ہیں“ یعقوب انصاری نے زندگی کے ایک بدصورت المئے کی طرف دھیان دلاتے ہوئے کہا۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم جن پر اپنی زندگی کی ہر خوشی نثار کر دیتے ہیں۔ اپنا تمام تر اثاثہ حوالے کر دیتے۔ جن کی خوشی کو اپنی خوشی پر ترجیح دیتے ہیں وہی ہمیں بوجھ سمجھتے ہیں اور ترس کھاتے ہوئے ہماری ضروریات پورا کرنے کو مہربانی پر محمول کرتے ہیں اور گھر کے بدلے دالان کا گوشہ دے کر سمجھتے ہیں کہ گوشے میں قفس کے بوڑھے کو آرام بہت ہے۔“ ”تمہارے غم سے ہمیں پوری ہمدردی ہے اور کوئی بوڑھا تمہارے خیالات سے اختلاف نہیں کرسکتا مگر گھر کی شوبھا گھر والی سے ہوتی ہے اب ہمیں گھر سے کیا مطلب“ نفیس احمد نے اپنے دل کا حال ظاہر کرتے ہوئے کہا ”دالان کا گوشہ بھی ہمیں منظور ہے۔ جس میں یاد ماضی کی طربناکی بھی ہے اور تنہائی کی کربناکی بھی ہے۔ لیکن اپنوں کے کترا نے گزر جانے کی ادا مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ جس طرح خوشی اظہار سے دوبالا ہو جاتی ہے غموں کا بوجھ بھی بیان کرنے سے ہلکا ہو جاتا ہے ہمارا سب سے بڑا غم یہ ہے کہ نئے دور کا انسان ہم سے بات کرنے کو تیار نہیں ہے حالت یہ کہ بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری“

''آپ کی طرح باتیں بھی پرانی، فرسودہ اور بیکار ہو چکی ہیں۔'' امجد علی نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے بتایا ''زمانہ بدل چکا ہے۔ ہر شے کا پیراہن نیا روپ لے چکا ہے حد یہ کہ جینے اور سوچنے کا انداز بدل چکا ہے۔ آپ نے گاؤں کے ماحول اور معاشرے میں زندگی گزاری ہے۔ ہماری نئی نسل شہروں اور بیرون ملک کی آب و ہوا میں رہتی ہے۔ ان کو آپ کی باتیں بے لطف اور ماضی کا قصہ معلوم ہوتی ہیں۔ جو اگر ادب کی زینت بنیں یا فلمائی جائیں تو دلچسپ اور شاہکار ہوتی ہیں۔ مگر مصروف زمانے کو مصیبت کا فسانہ خود اس کی زبانی سننے کی فرصت ہے اور نہ پسند ہے۔''

''دراصل ہم بوڑھوں کی حالت نصاب کی کتابوں کی طرح ہے'' عبدالمالک صاحب نے اپنی قابلیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ان سے علم اور کمال حاصل کرنے کے بعد جس طرح کتابوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے ضرور ہیں مگر بیکار اور بے فائدہ سمجھ کر کسی گوشے میں ڈال دیتے ہیں ٹھیک وہی حال ہم بوڑھوں کا بھی ہے۔ جن کو ہم اپنے لہو سے سینچ کر بناتے ہیں وہی ہمیں کامیابی کے زعم میں ناکارہ اور احمق سمجھتے ہیں۔'' آپ لوگوں کے خیالات سے اختلاف کی جرات نہیں کر سکتا مگر نئی نسل سے آپ کی تمام شکایتیں انصاف پر مبنی نہیں ہیں۔

عبدالجلیل حقیقت پسند انسان ہیں۔ ان کے دولڑکے عرب میں رہتے ہیں۔ زندگی ثمربار اور خود تجربہ کار ہیں۔ انہوں نے خاموشی توڑتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ نئی نسل نے گاؤں سے نکل کر بستی کی تصویر اور ہماری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ سسکتی ہوئی بدحالی کی جگہ کھنکتی ہوئی خوشحالی اور بدصورت چھپر کی جگہ خوبصورت چھت ان کے قابل قدر کارنامے ہیں۔ ان کا مشکور ہونے کی بجائے شکوہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہماری خاطر وطن سے دور کتنی بڑی قربانیاں دے رہے ہیں؟'' جلیل بھائی! ہم نے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا آپ نے ہماری رہنمائی کر کے بڑا احسان کیا ہے'' جیسے اپنی غلط فکر کا اعتراف کرتے ہوئے نفیس احمد نے کہا۔ ہم اپنے بچوں سے خواہ مخواہ بدگمان تھے۔ سچ ہے کہ بڑھاپا خود غرض ہوتا ہے۔ اگر ہماری نئی نسل بستی کی سرحدوں سے باہر نکل کر جد و جہد نہیں کرتی تو ہماری بستی اور ہم لوگ ماضی کی یادگار ہوتے اور آثار قدیمہ کا محکمہ ہمیں محفوظ کر لیتا۔'' آپ

لوگوں نے بہت اہم حقائق کا انکشاف کر کے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں مگر'' جمال الدین نے تاکید کرتے ہوئے بوڑھے کے بے حد اہم المیئے کی طرف توجہ دلائی۔ نئی نسل نے ہمارا اور بستی کا نقشہ ضرور بدل دیا ہے۔ لیکن ایک غم ناک وبا آئی ہوئی ہے کہ سب لوگ اپنے بال بچوں کو بھی شہر میں اپنے ساتھ رکھنے لگے ہیں۔ گاؤں جوانوں کے قہقہوں کی موسیقی سے محروم ہو گئے ہیں۔ خوبصورت مکانات اداس لگتے ہیں۔ ہم بوڑھے جیسے ان کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ جو بچوں کی گلکاریوں کو ترستے ہیں۔ جن کو ہر وقت دیکھنے کا ارمان ہے۔ ان کی صورتیں دیکھنے کے لئے ہم برسوں سے بیقرار رہتے ہیں۔ یہ نئے دور کا ہم بوڑھوں پر بڑا دردناک جبر ہے۔ ہمارے خوبصورت گھر بہو کے بغیر اس جنت کی طرح ہیں جس میں کوئی حور نہ ہو۔''

''دنیا والے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بوڑھے صرف اپنی ضرورت کے لئے بچوں کی طرح مچلتے رہتے ہیں۔ سہراب نے خودغرضی پر مبنی بیزارکن ماحول کی بوریت کو ختم کرتے ہوئے احساس دلایا۔ آپ لوگ کیسے احباب ہیں جو انصاری کی غیر حاضری کا احساس بھی نہیں ہوا وہ کس حال میں ہے ہمارا فرض ہے کہ اس کی خیریت دریافت کریں۔''

''انصاری نے بڑھاپے میں ایسی نازیبا حرکت کی ہے کہ پردہ نشین کی طرح گھر میں پڑا ہے۔ سلطان احمد نے تنہا قہقہہ لگا اور آواز میں نقلی دانتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ میں کل اس سے ملنے گیا تھا۔ جس طرح کوئی پردہ نشین کسی غیر محرم کے سامنے آتی ہے۔ وہ تولیہ میں منہ لپیٹ کر میرے سامنے آیا تو سفیدی کی جگہ کسی دوشیزہ جیسے سیاہ بال اور پچکے پوپلوں کی جگہ پھولے پھولے گال دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دوست تم نے کون سی تیر بہدف دوا استعمال کی ہے جو راتوں رات جوانی پلٹ آئی ہے۔ ذرا ہمیں بھی بتاؤ۔

''تم بھی ہمدردی کے بجائے جلے پر نمک پاشی کرنے چلے آئے'' اس نے اپنی بدترین غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اشکوں کی زبان میں اپنی دردناک کہانی بیان کی۔ ''سیلون والے کے بہکاوے میں آ کر خضاب لگانے کی ایسی شرمناک حماقت کر بیٹھا کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ اس پر ستم کہو یا سزا کہ ردعمل کی وجہ سے گردن کا اوپری

حصہ پھول کر ایک نیا روگ بن گیا ہے۔

"بھیا گئی جوانی پھر نہ لوٹے چاہے دودھ ملیدہ کھاؤ" رحمت علی نے بات اچک کر اپنے دل سے آہوں کی صدا نکالی تو حکیم مجیب الرحمٰن نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے اعلان کیا۔ ہمارے طب میں ایسے ایسے معجون، مرکبات اور مغزیات کے نادر نسخے موجود ہیں جو بوڑھوں کو جوان بنا سکتے ہیں۔

حکیم صاحب کے حیات افروز انکشاف پر بوڑھوں کے چہروں پر امید، تجسس اور مسرت کے آثار درخشاں ہو گئے۔ حکیم صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ افسوس کہ نسخوں کے مطابق خالص دوائیں اور جڑی بوٹیاں دستیاب نہیں ورنہ آپ کی کمان کی طرح ٹائٹ ہو جاتی" جیسے طنزیہ قہقہوں نے حکیم صاحب کو سنگسار کر کے رکھ دیا اپنے جملے کی زبردست کامیابی پر مسرور علیم نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ یہ حکیم قبرستان آباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ حکیم پر رحم کرو بھائی لوگ، حیات و موت کا پورا پا ور خدا نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا ہے" جمال الدین نے اپنی بات کو اہم بتانے کے لئے ذوق کی مدد لی لائی حیات آئی قضا لے چلی، چلے"

"مگر اپنی خوشی سے کوئی مرنے کو تیار نہیں ہوتا" سلیم کاتب نے اپنی بات کی تائید میں ایک واقعہ پیش کیا۔ ایک ماں اپنے بیمار بیٹے کی محبت میں لوگوں کے سامنے بار بار خدا سے دعا کرتی تھی کہ بیٹے کے بدلے میں مجھے اٹھا لے۔ اتفاق سے بھینس کھل کر اس کے کمرے کے سامنے آ گئی۔ وہ ڈر گئی اور ملک الموت سمجھ کر جلدی سے بولی۔

ادھر نہیں......ادھر نہیں...... مریض بغل کے کمرے میں ہے۔

"بہر حال ہمیں چلنا بھی چاہیئے یار زندہ صحبت باقی" قہقہوں کے درمیان کسی مجلس کے صدر کی طرح حافظ کے اعلان پر سب مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور حافظ صاحب حسب عادت گنگناتے ہوئے چلے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ!

☆☆

جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا

پنچایت الیکشن کی پر شباب سرگرمیاں سنگین حد تک خطرناک مرحلہ میں پہنچ چکی ہیں۔ مکھیا کے امیدوار لڑاکو سانڈ کی طرح سینہ سپر ہو کر آمنے سامنے اکھاڑے میں طاقت آزمائی کے لئے کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے تمام داؤ پیچ اور جا و بے جا سارے حربے آزمانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کیونکہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

کون خوش نصیب اپنے حریف کی چھاتی پر چڑھ کر فتح کا علم بلند کرے گا اور کون بدنصیب اپنی ناکامیوں کا زندگی بھر احتساب کرتا رہے گا یہ تو بیش بہا قیمتی ووٹوں کی گنتی کے بعد ہی معلوم ہوگا مگر اس وقت پنچایت کا ماحول زیر و زبر ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسری پنچایتوں میں ڈھیر سارے امیدوار دھکم دھکا کرتے اور نگری نگری دوارے دوارے ڈھول بجاتے اور ہاتھ پسارے پھر رہے ہیں۔ مگر میری پنچایت میں دو ہی امیدوار چناؤ کے دنگل میں پینترا بازی دکھا رہے ہیں۔ دراصل اور بھی کئی لوگ مکھیا بن کر چیک کاٹنے اور مال بٹورنے کا سپنا دیکھ رہے تھے لیکن ان دونوں بھاری بھرکم امیدواروں کے تیور نے انہیں پہلے ہی پچھاڑ کے رکھ دیا اور ان کے دلوں کے ارمان کلیجے میں ہی مچل کر رہ گئے۔

الیکشن کا پہلا دور شروع ہوا کلیم الدین کا رنگین پوسٹر پہلے دیواروں پر چسپاں ہوا تو اس کے حامیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے لیکن نعمت اللہ کے حامیوں کو سبکی محسوس ہوئی اور جب نعمت اللہ کا پوسٹر اوپر ہوا تو دوسرے فریق کو شرمندہ ہونا پڑا۔ کیونکہ کلیم کے پوسٹر میں اردو کو ہندی کے نیچے جگہ دی گئی تھی جبکہ نعمت اللہ کے پوسٹر میں اردو کا مقام ہندی کے اوپر تھا اور اس کے حامی فخریہ کہتے تھے کہ جس آدمی کو اپنی مادری زبان کا مقام نہیں معلوم وہ کسی

شریف آدمی کو عزت کیا دے گا؟

کلیم الدین شاندار جلوس نکالنے میں بھی پہل کر گیا۔ بینڈ پارٹی جلوس کے آگے چل رہی تھی درمیان میں شہر سے آئے اور دیہاتی جوانوں کی ٹولی موسیقی کی دھنی پر انگریزی ڈانس جگہ جگہ ٹھہر کر کرتی تھی اور ایک زبردست چنگار کے بعد فلک شگاف نعروں سے در و بام لرزاتا ہوا گزر رہا تھا۔ امنگوں کے جنون میں شرسار جلوس نے سڑکوں کا سینہ مسل کر رکھ دیا تھا جسے دیکھ کر مخالف کے دلوں پر چھڑیاں چل رہی تھیں۔

نعمت اللہ اور اس کے حامیوں نے جلوس کو ایک چیلنج کے روپ میں قبول کیا۔ ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ابتدا میں ہی کلیم الدین اسے دھول چٹا دے گا۔ نعمت اللہ نے اپنے حامیوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لئے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ایسا آئیٹم پیش کرے گا جو گاؤں والوں نے کبھی سوچا ہوگا، دیکھا ہوگا اور نہ کبھی سنا ہوگا اور کلیم الدین تو کیا اس کے پرکھے بھی اس کا جواب نہیں دے سکیں گے۔

نعمت اللہ نے اپنے دعوی سے بھی کہیں بڑھ کر وہ نظارا پیش کیا جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ عام دنوں میں میں کوئی شریف آدمی اپنی پردہ نشیں خواتین کو ایک لاکھ روپیہ دینے پر بھی اس طرح بے پردگی بے حیائی اور بے باکی کا مظاہرہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لوگ لاکھوں کا تماشہ مفت میں دیکھ رہے تھے۔ جو خواتین سو بار اپنے جسموں کو برقعوں میں چھپا کر گھروں سے باہر نکلا کرتی تھیں وہ آنچل کو گلے میں لپیٹے ہوئی اور لڑکیوں نے اوڑھنی کو کمر سے لپیٹ رکھا تھا اور بینڈ باجے کی دھنوں پر اچھل اچھل کر نعرے لگا رہی تھیں مردوں کا ہجوم پیچھے پیچھے ان کی صداؤں میں اپنی آواز ملاتے ہوئے چل رہا تھا۔ کسی کے لئے عبرت کا مقام تھا تو کسی کے لئے راحت کا سامان تھا۔ لگتا تھا جیسے ان کے جسموں میں کوئی اور روحیں حلول کر گئی ہیں۔ انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہوا ان کا جلوس معاشرے کی تاریخ، تہذب قدروں کو قدموں تلے روندتے، مسلتے، کچلتے اور مٹاتے ہوئے گزر رہا تھا اور دیکھنے والے لاکھوں کا تماشہ مفت میں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ایسا تماشہ پھر دیکھنا نصیب میں نہ ہو۔ لیکن عزت داروں نے خود غرض سیاست پر لعنت بھیجتے ہوئے اپنا دروازہ بند کرلیا

تھا۔ پھر بھی ان کی آوازیں سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔"

کسی کی سینڈل لڑھک گئی۔ کسی کے ایک کان کا جھمکا گر گیا اور کسی کی چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر چور ہو گئیں۔ مگر مستی میں کسی کو ہوش کہاں تھا۔ زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار تمام بندشوں سے آزاد ہو کر نمائش کا موقع ملا تھا۔

آگے کا حال خدا جانے مگر اس وقت کلیم الدین اور اس کے حامیوں کا کلیجہ چور چور ہو رہا تھا۔ نعمت اللہ نے جلوس کے ذریعہ ثابت کر دیا تھا کہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے کسی اصول، ضابطے اور قوانین کی پرواہ کئے بغیر ساری ایسی دیواریں مسمار کر کے رکھ دے گا جو اس کی راہ میں حائل ہوں گی۔ مہیلا جلوس نے جس بے حیائی کا مظاہرہ کیا تھا اس کا جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ برہنہ جلوس نکالا جائے مگر اس شرمناک تصور کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ شاطر ہی کیا جو حریف کی چالوں کا جواب نہ دے سکے۔ کلیم الدین نے جواب میں ایسا اہتمام کر دیا کہ نعمت اللہ اور اس کے حوارین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نادیدہ طاقت ان کے دلوں پر پتھر برسا رہی ہے اور روحوں کو سنگسار کر رہی ہے۔

کلیم الدین کے حامی کے گھر پر ایک مذہبی تقریب کا زبردست اہتمام کیا گیا۔ معاشرے میں عورت کا مقام اور پردے کی اہمیت پر تقریریں ہوتیں۔ رات بھر پنچایت میں اذیت ناک، کربناک اور دلخراش عذابوں کا نقشہ کھینچا اور خلاصہ پیش کیا جاتا تھا کہ اصول و قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے گنہگاروں، خطاکاروں اور ناہنجاروں کا وجود لرزہ براندام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے بستروں پر تڑپتے، خود پر ملامت کرتے اور استغفار کرتے رہے ہوں گے مگر رات بھر کسی کروٹ چین نصیب نہ ہوا ہوگا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ نعمت اللہ چند دنوں شرم سے سامنے نہیں آئے گا۔ مگر شرم سیاست کے لئے زہریلا ہلاہل ہے سیاسی شعبدہ، گر معصوم عوام کو رجھانے کے لئے مداری کی طرح نت نئے نظر بند کے کھیل پیش کرتا رہتا ہے۔ نعمت اللہ نے اپنے حامیوں کے ذہنوں کو بدلنے، دلوں سے خوف دور کرنے اور حوصلہ بلند کرنے کے لئے زنانہ اور مردانہ قوالی کا مقابلہ

کروادیا تو کلیم الدین نے اس کے جواب میں آرکسٹرا کا شاندار پروگرام کرا کے قوالی کا رنگ اتار دیا۔ پروگرام کے بعد بھی لوگوں کے تصور میں حسن کی توبہ شکن ادائیں اور ہونٹوں پر گیت کے بول تھرک رہے ہیں۔ تیرے بغیر ساجن چوڑی مزا نہ دے گی۔

سیاسی دنیا میں چائے خانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں شب و روز کسی کو مات اور کسی کو جیت کا سرٹیفیکٹ تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ یہیں سے راہیں بھی نکلتی ہیں اور افواہیں بھی پھیلتی ہیں لہٰذا حسب معمول چائے کے عادی جب پہنچے تو معلوم ہوا کہ نعمت اللہ نے تمام چائے خانوں کو ریزرو کر کے چائے فری کر دیا ہے۔ جو لوگ دعا گو رہتے ہیں کہ الیکشن کا موسم بہاراں بار بار آتا رہے ایسے مفت خوروں کے لئے یہ مژدہ جاں فزا تھا ایک کپ اپنی چائے پیتے والے مفت کو ملی تو بار بار پیتے تھے اور نعمت کا ذکر بھی چلتا رہتا تھا۔ اس کی یہ چال بڑی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ چرچا ہی تو سیاست کی جان ہوتی ہے۔

کلیم الدین نے حریف کے چیلنج کا ترکی بہ ترکی اینٹ کے بدلے پتھر سے جواب دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور سارے تاری خانوں کو الیکشن تک مخصوص کر لیا اور اعلان عام کر دیا ہے کہ بلا تفریق و تحقیق پارٹی و حمایتی جس کو جس قدر پینا ہو میری طرف سے تاری پی سکتا ہے۔ کلیم الدین کا یہ قدم بڑا رنگین بھی ہے اور سنگین بھی ہے۔ پینے والوں کی پوچھئے مت جو پینا ترک کر چکے تھے وہ تو اپنی توبہ کو مٹکا میں ڈبو ڈبو کر تاری لنڈھا رہے ہیں۔ بلکہ جس نے کبھی چکھا بھی نہیں تھا وہ بھی مفت کی ملنے پر شوقیہ غٹا غٹ تاری انڈیل رہے ہیں۔ چائے کے عادی تو دامن بچاتے خود کو چھپاتے اور اپنی عزت کی خیر مناتے چلتے ہیں جبکہ تاری پینے والے اکڑ دکھاتے اینٹھتے اور للکارتے پھر رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

مفت کی پیتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ ہاں
رنگ لائے گی مرے کردار کی پستی پول کے دن

پنچایت کا انتخاب کب کیا گل کھلائے گا یہ تو کوئی نہیں جانتا ہے۔ مگر آثار اچھے نہیں ہیں۔ امن پسندوں کی دلی خواہش ہے کہ لمحات سمٹ جائیں اور یہ ہنگامی اور سنگین حالات بلا تاخیر ختم ہو جائیں۔ مگر مفت خوروں کو شدید اختلاف ہے۔ وہ دعا گو ہیں کہ چناؤ کی تاریخ

اور آگے بڑھ جائے تو بہتر ہے۔ جمہوری اعتبار سے ان کی اکثریت ہے۔ آگے کیا ہوگا خدا جانے۔

تادم تحریر اپنی ننگی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے۔ اپنے کانوں سے جو سنا ہے اور جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اسے دیانتداری سے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ لیکن یہ مجھ پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ کسی بھی شریف آدمی کو جب تک جان و مال اور عزت و آبرو کے حفاظت کی گارنٹی نہیں مل جاتی ہے۔ وہ کسی قیمت پر یہ نہیں بتائے گا کہ کون امیدوار اچھا آدمی ہے۔ وہ کسی کی حمایت کرے گا اور کس امیدوار کے کامیاب ہونے کا قوی امکان ہے کیونکہ پنچایت کی فضائیں شب و روز دھمکی آمیز نعروں سے لرزہ براندام رہتی ہیں کہ جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔

☆☆

ہم کیا جواب دیں

مجید جوتا والا دکان کا شٹر اٹھانے کے بعد حسبِ معمول اخبار پر پہلی نظر ڈالتے ہی پھڑک تھا۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ بدزبان، بدکلام، بے لگام اور زہر افشانی کرنے والے ایک شاطر کو ریاست میں نفرتوں کا بیج بونے سے پہلے حکومت نے ہوائی اڈے سے ہی واپس بیرنگ کر دیا تھا۔ مخدوم، گوتم، جہانگیر اور گرو جی کی پاک سرزمین کا تقدس آلودگی سے محفوظ رہ گیا تھا۔

اس خبر نے مجید جوتا والے کو اس قدر متاثر، مست اور مسرور کر دیا کہ اس نے دوسری اہم خبروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اخبار ایک طرف اچھال دیا اور دکان میں سجے ہوئے جوتوں کو اس طرح پیٹ پیٹ کر صاف کرنے لگا جیسے کسی نادیدہ دشمن کو جوتے لگا رہا ہو۔ اس حرکت سے وہ بے حد تسکین محسوس کر رہا تھا۔

"یہ آفت کا پرکالہ کدھر سے آ گیا"

سراج سیلانی کو اپنی دکان کی طرف آتے ہوئے دیکھ کر مجید کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑا۔ کچھ دیر پہلے جو مستی طاری ہوئی تھی وہ سیلانی پر نگاہ پڑتے ہی کافور ہو گئی۔ ابھی ایک روپیہ کا دیدار نصیب نہیں ہوا اور بن بلائے مہمان خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ جیسے چائے پان سے تواضع کا فرض ادا کرنے کے لئے ہی تو سویرے دکان کھولی ہے اپنی فکر نہیں کرتا اور خواہ مخواہ شہر کا قاضی بنا پھرتا ہے۔ سارے جہاں کا درد اسی کے جگر میں ہے۔ جب دیکھئے بلائے ناگہانی کی طرح یہ آفت کا پرکالہ نازل ہو جاتا ہے کام چور، حرام خور اور بے حیا

کہیں کا، سیلانی کے دکان تک پہنچنے سے پہلے مجید نے دل ہی دل میں اس کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ مگر قریب آنے پر کسی عیار لیڈر کی طرح خندہ پیشانی کے ساتھ سویرے آمد پر حیرت اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سبب دریافت کرنے پر سیلانی نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بتایا۔ آپ لوگوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے آتا ہی رہتا ہوں مگر اس وقت ایک اہم ضرورت سے حاضر ہوا ہوں۔

سویرے سویرے یہ مصیبت در مصیبت کہاں سے آ گیا۔ ایک تو کریلا اس پر نیم چڑھا۔ مجید کے دل میں برقی رو کی طرح خیالات کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اب یہ یقیناً فرمائے گا کہ بیوی بچہ سخت بیمار ہے۔ خدا کے لئے مہربانی کریں آپ کی رقم بہت جلد لوٹا دیں گے۔ اگر جناب چالباز ہیں تو بندہ سوا سیر ہے۔ جتنے لوگوں کو یہ فریب دیتے ہوں گے ان سے کہیں زیادہ گاہکوں کو میں روزانہ چونا لگاتا ہوں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ان سے پہلے میں خود اپنی مجبوریوں پر کیوں نہ پریشانیوں کا اظہار شروع کر دوں۔ یہ سوچ کر اپنے چہرے پر مصیبت اور مسکنیت کے آثار پیدا کرتے ہوئے اس نے تمہید باندھا۔

”اپنی حالت کیا بتائیں سیلانی صاحب کاروبار کی حالت بہت خراب ہے معمولی سی جوتے کی دکان پر ہی سارا انحصار ہے بمشکل گزر اوقات ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جوان لڑکی کی شادی کا مسئلہ راتوں کی نیند حرام کئے ہوئے ہے۔ رشتہ ملنا تو مطالبات اوقات سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ کہیں مطالبات نہیں ہوتے تو کم از کم شادی کا خرچ دینے کی بات ہوتی ہے۔ بڑی مشکل میں جان ہے۔ میں کہتا ہوں شادی کا ایسا طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتے جس میں بے انتہا غیر ضروری اور فضول خرچ کا عذاب نہ ہو۔ اس طرح بہتر رشتے ملتے اللہ بھی راضی ہوتا اور شادی واقعی مسرتوں کے تہوار کا گہوارہ بن جاتی۔

کچھ ضرورتیں ہر حالت میں پوری کرنا ہوتی ہیں۔ مجید کی تمہید طولانی کو مسکراتے ہوئے سننے کے بعد سیلانی نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ میں تو سب کی حالت سے واقف ہوں۔ لیکن اس وقت آپ کی لڑکی کے لئے ایک معقول منسوب کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ خدا کی مہربانی اور لڑکی کی قسمت سے یہ پیغام آیا ہے صرف آپ ہاں

کہیں اور بات پکی۔'' اگر میری بساط کے مطابق ہوا تو ''اندھا چاہے دو آنکھ کی طرح مجید کا دل پھڑک اٹھا چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ''میرے لئے اس سے بڑی خوشی اور خوش نصیبی کی بات اور کیا ہوگی۔''

دراصل لڑکے نے لڑکی کو کہیں نہ کہیں خود دیکھ کر پسند کرلیا ہے سیلانی تفصیل بتانے لگے۔ لڑکے نے گھر کا بار اٹھا رکھا ہے اس لئے وہ خود اختیار ہے اس کی پسند کو والدین کی بھی تائید حاصل ہے۔ قابل تعریف اور خوشی کی بات یہ ہے کہ کوئی مطالبات نہیں ہیں اور رخصتی کی رسم سادگی سے انجام پذیر ہوگی۔

''سیلانی صاحب لڑکے کے متعلق بھی کچھ بتائیں۔'' مجید کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ قدرت اس طرح مہرباں ہوگی اس نے بے صبری سے پوچھا ''کس کا چشم وچراغ ہے کیسا ہے اور کیا کررہا ہے۔''

''وہ اپنے بھائی امجد علی کا بڑا لڑکا ہے'' سیلانی بتانے لگے صحت مند اور خوبصورت ہے۔ دہلی میں اپنا سوٹ کیس کا کارخانہ ہے۔ معقول آمدنی ہے۔ آپ خود ان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ خدا نے اس رشتہ کو کامیاب کیا تو لڑکی سکھ کی زندگی گزارے گی۔''

آمین، ثم آمین!! مجید نے بے انتہا مسرتوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ واقعی عزت واحترام کے قابل ہیں ہم لوگ تو خود غرض ہیں۔ جانور کی طرح اپنے لئے جیتے ہیں مگر آپ کا دردمند دل انسانیت کے دکھ سکھ کے لئے دھڑکتا ہے میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''یہ کوئی احسان نہیں ہے انسان کے کام آنا انسان کا فرض ہے۔'' سیلانی نے انکساری سے کہا میں محض معمولی سا آدمی ہوں۔ کسی کے کام آگیا تو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ بہرکیف چند دنوں میں لڑکا دہلی چلا جائے گا۔ عید کے بعد کسی روز سعید کو رخصتی ہوجائے گی۔ اس وقفہ میں آپ تیار ہو کر وقت کا انتظار کریں۔''

''میں آپ کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مجید نے انتہائی خندہ پیشانی، فرمابرداری اور احسان مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پل بھر میں اس کے دل کی کیفیت

اور سماں بدل گیا۔ جس منحوس کے سراپے پر نظر پڑتے ہی ذہن مکدر اور پراگندہ ہوگیا تھا۔ وہ خوشخبری کی نوید سنا کر واپس لوٹتا ہوا فرشتہ معلوم ہو رہا تھا۔

اور دنوں کی طرح بھیگی بلی بنے رہنے کی بجائے سینہ تانے ہوئے مجید گھر میں داخل ہوا اس کا چہرہ دمک رہا تھا لڑکی کی شادی کے مسئلہ پر بیگم ہر وقت لڑنے کو تیار رہا کرتی تھی خدا کی مہربانی سے وہ منسوب طے کر کے آیا تھا اس لیے اس کا رتبہ ہی کچھ اور تھا۔ گھر میں اس نے قدم رکھتے ہی بیگم کو آواز لگایا۔ سنو کی امی ذرا جلدی ادھر تو آنا۔

آج کون سا تیر مار کر آرہے ہیں جو آواز بھی بدلی ہوئی ہے۔ قریب آنے کی بجائے بیگم نے کچن سے ہی تیر چلایا وہ اس کی فطرت سے واقف تھا اسے خود خوشی ہو رہی تھی۔ وہ خوش خبری سنانے کی عجلت میں خود ہی کچن کے سامنے پہنچ کر اپنی بات کی ابتدا کرتے ہوئے بیگم سے پوچھا ''سیلانی صاحب کو تو تم جانتی ہو'' ''ہاں ہاں وہی آوارا گرد جو اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی خراب کرتا پھرتا ہے۔'' وہ سیلانی کا نام سنتے ہی چراغ پا ہوگئی اور ہاتھ نچاتے ہوئے شعلے برسانے لگی۔ ایسے ہی مفت خوروں کی صحبت نے آپ کو نکما اور دکان کو چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ گل چھڑے اڑا رہے ہیں۔ ''تم ہر وقت جھگڑنے کے لئے تیار رہتی ہو'' بیگم سانس لینے کو رکی تو مجید نے بلند آواز میں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات کان کھول کر سن لو میں نسو کا رشتہ طے کر کے آرہا ہوں تم اب خوشامد بھی کرو گی تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

مجید دھما کہ کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا اور بیگم یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں اس طرح محو ہوگئی کہ توے میں روٹی رکھ کر بھول گئی۔ روٹی کے جلنے پر جیسے خواب سے بیدار ہوئی۔ اگر کوئی اور بات ہوتی تو کسی قیمت پر اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی مگر لڑکی کی شادی کا معاملہ تھا۔ مجید کے کمرے میں آ کر چپ چاپ بیٹھ گئی ''ہر وقت تمہارا تیور چڑھا رہتا ہے تم سے کوئی کیا بات کرے'' مجید کا پلڑا آج بھاری تھا اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا مگر پھر بیگم کی حالت پر ترس کھا کر اس نے شادی کے متعلق تمام باتیں کہنے کے بعد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں صرف وقت کا انتظار کرنا ہے اور اپنے طور پر تیار رہنا ہے۔''

‘‘توبہ توبہ اللہ معاف کرے’’ بیگم خوشی سے جھوم اٹھی اور ناپسندیدہ طرزِ عمل کے لئے معافی مانگتے ہوئے اعتراف کیا سیلانی صاحب کو میں غلط سمجھ رہی تھی۔’’ ‘‘وہ تو بڑے کام کے آدمی نکلے، ان کا احسان ہم کبھی نہیں بھولیں گے مگر دیکھئے آپ لاپرواہ آدمی ہیں بات کر کے سو نہ جائیں۔’’ بیگم تاکید کرتے ہوئے پھر روٹی سینکنے چل پڑی۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے وہ سوچ رہی تھی۔ کسی پر کبھی کبھی قدرت کس قدر مہربان ہو جاتی ہے۔ وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ سیلانی اکثر دکان پر آتے رہتے تھے۔ مجید ہر ملاقات میں احسان مندی کے لئے بچھا رہتا تھا اور اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کے دل میں سیلانی کے احترام کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ ہر ملاقات میں شادی کے چرچے ضرور ہوا کرتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں شادی کی تیاریوں کے متعلق مجید نے بتایا شادی کے لئے بیس ہزار کی رقم پس انداز کر رکھا تھا جس سے ضروری استعمال کے لوازمات خرید کر لئے ہیں اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے دس ہزار کا تخمینہ لگا رکھا ہے خدا کی مہربانی اور رقم کا کسی طرح انتظام ہو جانے کی امید ہے اگرچہ ان کا مطالبہ نہیں ہے مگر ہمارے بھی کچھ فرائض اور ارمان ہیں۔

اپنی عزت کی خاطر یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے رخصت ہوئے وقت سیلانی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا آپ بڑے خوش نصیب ہیں جو ایسا فراخدل برادر ملا ہے۔

مجید دور تک سیلانی کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس کا دل کہہ رہا تھا رحمت کا فرشتہ جا رہا ہے۔

انتظار کی لذتیں ختم ہوئیں اور ارمان پورے ہونے کے دن آ گئے۔

‘‘مبارک ہو مبارک ہو’’ سیلانی چہکتے اور مسکراتے ہوئے نوید جانفزا لے کر آئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولے لڑکا دہلی سے آ گیا ہے۔ ادھر کی تیاریوں سے میں نے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ لوگ بہت خوش ہیں۔ کل پھر ان سے ملاقات کر کے اگلے اقدام کے متعلق بتاؤں گا۔

ہمیں کل کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ مجید کی حالت کو محسوس کرتے ہوئے سیلانی نے کہا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے سارا پروگرام میری نگرانی میں نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا جائے گا۔

''خدا کرے خدا کرے'' سیلانی کی خوش آئند بات پر مجید کا دل فرط انبساط سے جھوم اٹھا۔

''اگر سیلانی صاحب دکان پر نہ آئیں تو آپ خود ان سے ملاقات کر لیجئے گا۔'' دوسرے دن بیگم نے بہت دنوں بعد محبت اور مسرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مجید کو دوکان پر روانہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی مسرور اور مضطرب تھی کہ اسی وقت سے رات ہونے اور مجید کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ...... بار بار دروازے کی طرف اس کی نظر اٹھ جاتی تھی اور اپنی حالت پر اس کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھتے تھے۔ اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا۔ کہ اس کے ارمان اتنی آسانی سے پورے ہو جائیں گے۔

خدا خدا کر کے رات ہوئی اور مجید گھر آتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیگم نے سوچا اپنی کامیابی پر نخرے دکھا رہے ہیں۔ یہ بھی کیا غرور کہ کسی سے بات بھی نہیں کیا اور کمرے میں گھس گئے۔ اسے آڑے ہاتھوں لینے کی ضرورت تھی۔ مگر مسرتوں کا سماں خراب ہو جانے کا ڈر تھا۔ لیکن بیگم کے لیے یہ خاموش بلاوا بھی تھا۔ وہ مسرتوں کے ہجوم میں رقصاں مجید کے کمرے میں چلی آئی۔ لیکن مجید کو سر پکڑ کر بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر انجانے خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ ''خدا خیر کرے کیا ہوا ہے جو آپ اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''ہم ان کی بات پر مقدور بھر تیاریاں کر کے خوش تھے۔'' مجید نے سر اٹھا کر درد بھری آواز میں بتایا۔ ''اب ان کا کہنا ہے کہ لڑکے کی خواہش ہے کہ صرف ایک موٹر سائیکل دیدیں کیا یہ ہماری بساط سے باہر کی بات نہیں ہے ہمیں آسماں کی بلندیوں پر پہنچا کر کوئی یوں اچھال دے گا یہ ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔''

میرے معبود ایسی خوشی کیوں دیدی جس کے پیچھے اتنے اذیت ناک غم لگے تھے۔ مجید کی بات پوری ہوتے ہی بیگم دھرام سے بستر پر گر پڑی اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آہوں کے ساتھ ایک ہی جملہ بار بار دہرانے لگی میرے معبود ایسی خوشی کیوں میرے معبود ایسی خوشی دیدی؟ مسرتوں کا رقصاں سماں سوگوار ماتم میں بدل کر رہ گیا۔ ان کو جواب دینے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں'' دوسرے دن دکان پر جاتے ہوئے بیگم کے سامنے کھڑے

ہوکر مجید نے پوچھا۔ ”تمہیں بتاؤ انہیں کیا جواب دیں۔“

بیگم نے مجید کی مایوس اور سوگ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں دیکھا اور اس کی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے رخسار سے پھسل کر اس طرح مٹی میں جذب ہو گئے۔ جیسے ان کے ارمان دفن ہو گئے ہوں۔ کاش لاتعداد ماؤں کے آنسوؤں میں پتھر کے دلوں کو پگھلانے کی تاثیر ہوتی؟

☆☆

مانگے کا اجالا

میری شادی کی تاریخ طے پا گئی تھی!

کسی بھی نوجوان کی طرح وہ میرے خوابوں اور خیالوں کے دن تھے۔ ہر طرف خوشی اور شادمانی رقصاں تھی۔ گیت اور سنگیت بکھرے ہوئے تھے۔ افسانوی ماحول کی طرح بنا کی سرشار کئے رہتی تھی۔ عجیب سا نشہ آور سرور چھایا رہتا تھا۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہ تھی لیکن جمالی کی پریشانی نے اس وقت تک پریشان بنائے رکھا جب تک برات میں شرکت کے لئے اس کی تیاریاں مکمل نہ ہوگئیں۔ کیونکہ جمالی کے پاس اپنی صرف تمنائیں تھیں۔ جن کو پورا کرنا صرف میرا فرض تھا؟

جمالی ارمانوں کی ایک دنیا کا نام تھا۔ جس کا اس کے باپ کی موت سے پہلے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اس کے مالدار مگر کنجوس ترین باپ کو بھی بیٹے کی موت منظور تھی مگر اس کے ارمان پورا کرنے کو تیار نہ تھا۔ جس طرح دوسرے مجبور کی ضروری اور غیر ضروری حاجتیں پوری کر دیا کرتا تھا، جمالی بھی اس میں شامل تھا۔ میری شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی اس کے پرخلوص جذبات مچل اٹھے تھے۔

شادی میری ہو رہی تھی اور جمالی کی خوشیوں کا یہ عالم تھا جیسے اس کی اپنی شادی ہو رہی ہو۔ جب دیکھئے برات میں شرکت کا پروگرام بناتا رہتا لیکن اس کے پاس سوائے پروگرام کے اپنا کچھ نہ تھا۔ اس کے پروگرام کی تکمیل مجھے ہی کرنا تھا جو بہت مشکل اور دشوار تھا، کیونکہ ان دنوں زندگی میں ایسی فراوانی نہ تھی!

آج آدمی محو پرواز ہے اور زندگی کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہیں۔

چاہے در پردہ جتنے زخم ہوں مگر یہ وہ دور ہے کہ عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ لیکن جب زندگی بناوٹ اور سجاوٹ سے بے بہرہ تھی۔ موسم کے بھروسے کھیتیاں ہوتی تھیں اور بیل گاڑی سے سفر کرتے تھے۔ لوگ لباس، چھاتہ اور جوتا مستعار لے کر برات اور رشتہ داروں کے یہاں جاتے تھے ایک شروانی میں جانے کتنی نکاح خوانی ہوا کرتی تھی اور یہ کوئی عیب اور شرم کی بات بھی نہ تھی!

ڈھنڈورا پیٹنے والوں کی سبھیتا اور سنسکرتی مزدور کی لنگوٹی کی طرح غائب ہو گئی ہے اور اب رکشہ چالک بھی پینٹ اور شرٹ میں دکھائی دیتا ہے لیکن ان دنوں پینٹ اور شرٹ سرکاری ملازم اور کالج کے طلبا کی پہچان تھی۔ جبکہ جمالی کا ارمان تھا کہ وہ پینٹ، شرٹ، چشمہ، گھڑی اور انگریزی جوتا میں برات جائے گا۔ ان کی اپنی صرف گنجی استعمال میں آ سکتی تھی۔ بقیہ مسئلہ مجھے حل کرنا تھا۔

خدا مغفرت کرے اختر علی کا جن کے تعاون سے ایک شرٹ اور ایک خوبصورت چشمہ حاصل ہوا تھا۔ وہ چشمہ مہیش کی شادی میں ایک طوائف بھول گئی تھی۔ گھڑی ساز نے اس شرط کے ساتھ گھڑی عنایت کیا کہ ٹائم دیکھنے کی زحمت نہیں کی جائے گی۔ جمالی نے انگریزی جوتا اپنے دوست پاسبان سے مستعار لے کر ہماری پریشانی کم کرنے میں تعاون کیا تھا۔ پینٹ کا حصول سب سے مشکل تھا۔ جو سب سے آسان ثابت ہوا کیونکہ ایک نا قابل استعمال پینٹ میرے بکس میں پڑا ہوا تھا۔ جسے قابل، درزی نے اپنے فن کا سارا کمال صرف کر کے قابل استعمال بنا دیا تھا۔ جس سے ایک مشکل آسان ہو گئی تھی!

تمام تیاریوں کے بعد جمالی میرے آبائی گاؤں پرسونی پہنچ گئے۔ ان کی خوشی اور طمطراق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس کی شادمانی ستم ایجاد آسماں سے دیکھی نہ گئی اور بدقسمتی کہئے کہ چشمہ کہیں کھو گیا۔ اگرچہ تلاش جاری تھی۔ مگر اختر میاں آپے سے باہر ہو گئے تھے۔

شور سن کر جس وقت میں دالان میں آیا۔ انتہائی خطرناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

اختر نے مضبوطی سے جمالی کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ جس کی گرفت سے جمالی کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور آواز بند ہو کر رہ گئی تھی اور اختر دوسرے ہاتھ میں جوتا لئے گالیوں کی

حلاوت کے ہمراہ چشمہ کے ساتھ شرٹ اتارنے کا بھی مطالبہ کر رہے تھے۔ مہمانوں کی خوشامد کے علاوہ میری مداخلت بھی ناکام ثابت ہو رہی تھی خدا جانے نوبت کہاں تک پہنچتی کہ خدا نے جمالی کی آبرو بچادی۔ ایک ایماندار مہمان کو چشمہ مل گیا اور چشمہ اختر کے حوالے کر کے وہ تعریف طلب نگاہوں سے مہمانوں کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی نے ان کی تعریف تو نہیں کی مگر جمالی کی حمایت میں راحت اور سکون کا سانس لیا تھا بہرحال چند مخصوص افراد ہی جمالی کے ملبوسات کی حقیقت سے آشنا ہو سکے تھے۔ برات کے دوران نہ صرف اس کی عزت و آبرو پر کوئی آنچ آئی۔ بلکہ برات میں وہ نمایا اور ممتاز نظر آنے کی کوشش میں شاندار طور پر کامیاب رہا اور دیکھنے والوں نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ کسی مالدار اور معزز گھرانے کا چشم و چراغ اور کالج کا ہونہار طالب علم ہے!

میں نے جمالی کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس کی سچائی کا یقین دلانے کے لئے میں کوئی بھی قسم کھا سکتا ہوں۔ مگر میرے دادا مرحوم شادی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان فرماتے تھے۔ اس کی سچائی کی تصدیق تو نہیں کر سکتا مگر جس طرح ہم لوگ اس دلچسپ واقعہ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یقیناً ہر سننے والے کو بے حد لطف آئے گا۔ اور پرانے دور کی تصویر نظر آئے گی۔

ان دنوں بارات بیل گاڑی سے جاتی تھی۔ جوانوں کی ٹولیاں گھوڑے اور سائیکل پر سوار ہو کر جوانی کی بہار کا مظاہر کرتے اور دولہا راجا پالکی پر سوار ہو کر خوابوں کے نگر جاتے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ آرام کرنے کے لئے ٹھہراؤ ہوا کرتا تھا۔ ایک مقام پر برات کے متعلق پوچھنے پر کسی نے بتایا برات رام نگر سے آتی ہے اور پریم نگر جائے گی۔ دولہا آپ کے سامنے ہیں۔ لیکن گُرتا، پاجامہ اور جوتا میرا ہے۔ صرف شروانی دوسرے آدمی کی ہے۔”

دولہا پہلے تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ پھر غصہ کے باوجود اپنی پوزیشن کا خیال رکھتے ہوئے دوست سے کہنے لگا۔ ”تم کو اگر اس طرح بے عزّت کرنا تھا تو تم نے کپڑے کیوں دئے؟ میں کسی اور سے کپڑے مانگ لیتا۔“

دوست نے معذورت کے ساتھ آئندہ احتیاط کا وعدہ کیا اور برات آگے چلی۔ دوسرے ٹھہراؤ پر لوگوں کے پوچھنے پر دوست نے لوگوں کو بتایا...... ”برات رام نگر سے آ رہی ہے اور پریم

نگر جائے گی۔ دولہا سامنے ہےاور ٹوپی سے جوتا تک ان کا اپنا ہے۔"

دولہا نے شدید غصہ کے ساتھ شدید احتجاج کیا! تم اپنی بیہودہ حرکت سے باز نہیں آؤ گے؟

"خدا کی قسم اب کچھ نہیں کہوں گا۔" دوست نے یقین دلایا اور برات آگے چلی۔ پریم نگر سے پہلے ایک بار پھر پالکی ٹھہری اور پھر کسی کے پوچھنے پر دولہا کے دوست نے بتایا۔ برات رام نگر سے آرہی ہےاور پریم نگر جائے گی دولہا آپ کے سامنے کھڑے ہیں مگر ان کے لباس کے بارے میں کچھ بتانے سے مجبور ہوں۔

دولہا اپنے دوست کی احمقانہ حرکتوں سے تنگ آچکا تھا۔ دوست کو ایک درخت کی اوٹ میں لے جا کر انتہائی غصہ اور آزردگی سے کہنے لگا۔ اس طرح ذلیل کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے کپڑے واپس لے لو۔ میں سسرال کی بجائے واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔ جب راستے میں تمہارے کمینہ پن کا یہ حال ہےتو محفل میں کیا کیا گل کھلاؤ گے؟"

اس کے بعد دوست نے اپنی زبان پر قابو رکھنے کی قسم کھائی اس پر قائم رہا اور حق دوستی نبھادی۔

نئی نسل کو یہ واقعات افسانوی اور جھوٹے معلوم ہوں گے لیکن میری طرح جو لوگ شادی کی چالیسویں سالگرہ منانے کی تیاری کرتے ہوں گے ان کو یاد ہوگا کہ اس دور میں زندگی کتنی تنگ دستی، غربت، عسرت اور مجبوری کا شکار تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو لباس، اسکول کی فیس، کتابیں اور ایک ساتھی کو بغیر سوٹ کے کالج میں جانے پر شرم آتی تھی تو سوٹ بھی سلوادیتے تھے۔ لیکن ہمالیائی سچ بتاؤں کہ والد کی تجارت کی کامیابی اور فراوانی سے پہلے جب میں اپنے گاؤں پرسونی سے پوپری آیا تھا تو میرے تن پر بھی دوسرے کا کپڑا امیر الباس تھا!

☆☆

کھوٹا سونا

سونے لال زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کا طوفان تھم گیا تھا اور اسمبلی انتخاب میں دوسری بار شاندار کامیابی پر سونے لال جی کے استقبالیہ کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں ان کی پارٹی کے ورکرس، اور حامیوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ خاص طور سے ٹھیکہ اور پیروی کے ذریعہ جیب بھرنے والے سفید پوشوں کے پاؤں زمین پر نہیں پر رہے تھے۔ لوگ اس کامیابی کو اپنی کامیابی تصور کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے فضاؤں میں مسرتوں کی شراب گھول دی ہو۔ ہر کوئی کامیابی اور شادمانی کے نشہ میں سرشار نظر آتا تھا۔

شہر سکھائے کوتوالی کے مصداق کوئی بھی آدمی کامیابی کے بعد سیاست کے رموز و کنایات اور مکر و فریب کے فن میں مہارت حاصل کر ہی لیتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو قدرت کسی نہ کسی مخصوص کام کے لئے پیدا کرتی ہے۔ ایسے ہی خاص لوگوں میں سونے لال جی بھی شمار کئے جائیں گے۔ جو سیاست کے لئے ہی دنیا میں آئے تھے۔ وہ عوام کا دل جیت لینے کے فن میں استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے سیلولر کردار، شیریں بیانی اور خاص طور سے اقلیت کی دلنوازی اور ناز برداری کے باعث لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت قائم ہو کر رہ گئی تھی۔ چہرے پر ہمہ وقت رقصاں مسکراہٹ میں ان کی مقبولیت کا راز پنہاں تھا۔

علاقے میں ان کے کارنامے اکثر مقامات پر نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص کوٹے سے اہم مدرسوں میں گیٹ بنوا دیئے تھے اور مسجدوں میں وضو کے لئے ...... پائپ لگوا دیئے تھے۔ وہ محرم کے اکھاڑوں کو اپنی جیب خاص سے چندے دیا کرتے تھے اور

تعزیوں کو خود کندھا دیا کرتے تھے۔ شب برات میں عبادت گزاروں کے ساتھ شب بیداری کیا کرتے۔ رمضان شریف میں مختلف مقامات پر افطار کا اہتمام کرتے اور دوسروں کے یہاں بھی افطار کرتے تھے۔ وہ خود بھی عید ملن کی تقریب کا اہتمام کرتے اور حلقہ میں گھوم گھوم کر عید کی مبارکباد دیتے۔ رمضان میں پورے مہینے گول ٹوپی ان کے سر کی زینت بنی رہتی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا وجود اقلیت کی خدمات اور دلداری کے لئے وقف ہو کر رہ گیا ہو۔ لیکن ہماری حکومت اور دوسرے اقتدار پرستوں کی طرح اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اقلیت کے ایسے کام نہ ہوں جس سے ان کی زندگیاں بہتر اور خوش حال ہو جائیں اور وہ غلامی سے آزاد ہو جائیں اور ان کے سماج کا کوئی فرد سیاسی دنیا میں اپنا وجود بنا کر ان کے غاصبانہ اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ بہر حال سونے لال جی کی مدھر بانی مہربانی اور قدر دانی سے ہر طبقہ متاثر اور مسرور تھا۔ ان کے ذکر پر اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ سونے لال جی صرف نام سے ہی غیر لگتے ہیں ورنہ......!

اردو مڈل اسکول کی ایک تقریب میں اپنے استقبالیہ کے جواب میں تقریر کے دوران سونے لال جی نے اقلیت کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا" آج میں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ لوگوں کے پریم اور مہربانیوں کا پھل ہے۔ میرے دل میں آپ کی اور آپ کے دھرم کی بہت عزت ہے۔ اردو بھاشا بھی مجھے بہت پسند ہے۔ جب بھی موقع ملتا ہے میں مہدی حسن، غلام علی اور جگجیت سنگھ کی گائی غزل بہت شوق سے سنتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے چاہنے کے باوجود آپ کی آبادی میں وکاس کا کام بھی کم ہوا ہے۔ دراصل سماج کے وکاس کے کاموں میں کوئی وقت دینے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے میں نے خاص طور سے آپ کے کاموں پر دھیان دلانے کے لئے اکبر بھارتی کو اپنا سکریٹری مقرر کیا ہے۔ آشا کرتا ہوں کہ ان کے مادھیم سے آپ کے احسانوں کا بوجھ ہلکا کر سکوں گا۔ سواگت کے لئے۔ دھنیہ باد" مشہور ہے کہ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ اکبر بھارتی نے بھی نئی دنیا میں داخلہ کے لئے زبردست تیاری کی تھی۔ کھادی کے سفید چولے میں اس کے سراپے پر جیسے نکھار آ گیا تھا۔ پیکینگ کا زمانہ ہے۔ مال چاہے گھٹیا کیوں نہ ہو۔ پیکنگ اگر خوبصورت

ہے تو قیمت اور مانگ بڑھ جاتی ہے۔ سفید پوشی اور پرفریب لفاظی تو سیاست کی اثاث ہے۔ ماہر سیاست داں عوام کو متاثر کرنے کے لئے ہر طبقہ کے خوبصورت فرد کو بطور سائن بورڈ اپنے قریب رکھتا ہے۔ جو بظاہر بااثر معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ حکم کا غلام ہوتا ہے۔ جو اپنے سماج سے لاتعلق اور نالائق ہوتا ہے وہ سیاستدانوں کے لئے اہم اور لائق ہوتا ہے اکبر بھارتی اس کسوٹی پر پورا اترتا تھا، آخر سونے لال جی کی پارکھی نگاہوں کا انتخاب تھا۔ مخصوص کمرے کی تنہائی میں ایک فہرست بڑھاتے ہوئے اکبر بھارتی نے سونے لال جی سے ادب سے کہا۔ ”سر آپ نے اپنی تقریر میں جو اشارہ کیا تھا اس کی روشنی میں اقلیت کے حلقہ میں وکاس کے کاموں کی فہرست تیار کر کے لایا ہوں۔“

”تم یہ فہرست اپنے پاس ہی رہنے دو کبھی کام آئے گی“ سونے لال جی نے بغیر دیکھے ہوئے فہرست لوٹاتے ہوئے کہا ”اگر سارے کام ہو ہی جائیں گے تو ہمیں کون پوچھے گا؟ اور ہم کس کام کا وعدہ کر کے پھر ان کی حمایت حاصل کریں گے؟ سب سے اہم بات جان لو کہ تمہیں برادری نے اپنا لیڈر نہیں بنایا ہے بلکہ میں نے تمہیں باعزت مقام دیا ہے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ برادری کا نہیں بلکہ صرف میرے اور پارٹی کے فائدے کے لئے تم اپنی برادری میں کام کرو گے۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ دوسروں کے فائدے کی بات کر کے اپنا فائدہ حاصل کرنے کا نام سیاست ہے۔“

کائنات میں کیسی عجیب مخلوق ہے جو ہمدردی، حمایت، عزت اور محبت کرنے والوں کو بدلے میں صرف جھوٹے وعدے طفل تسلی اور حسین فریب دیتا ہے۔ سونے لال جی کے کمرے سے واپس جاتے ہوئے اکبر بھارتی الجھ کر رہ گیا تھا۔ سیاستدانوں کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں اتنا فرق اور اس قدر تضاد ہوتا ہے۔ اس انکشاف پر وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا!

اسمبلی انتخاب کا موسم قریب تھا اور اس کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اکبر بھارتی سونے لال جی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر علاقہ کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”سر لوگ تو آپ سے بہت خوش ہیں۔ لیکن ان کو شکایت ہے کہ ان کے حلقے میں وکاس کا کام نہیں کے برابر ہوا ہے۔ خاص طور سے ان کے بنیادی کام جیسے اسکول کی

عمارتوں کی تعمیر اور پرانی عمارتوں کے مرمت کا کام، ہندی ٹیچروں کا اردو ٹیچروں کی جگہ تقرر، اور وقت پر درسی کتابوں کی عدم فراہمی جیسا اہم مسلہ حل نہیں ہوا۔ جس سے نہ صرف بچے اپنی مادری زبان سے محروم ہو رہے ہیں بلکہ متعصب حکام کی سازش کے باعث اردو زبان ختم کی جارہی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بیکار جوانوں کو ٹھیکہ کا کام نہیں دیا گیا۔ ہمیں صرف باتوں سے بہلایا جارہا ہے۔''

''تمہاری برادری کا یہ بہت پرانا راگ ہے۔ جو فکر کی بات نہیں ہے'' سونے لال جی نے اکبر بھارتی کی رپورٹ کا لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ تمہارے لوگ بات کرنے کا بہت سندر طریقہ اور انداز جانتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ باتوں سے ہی بہل جاتے ہیں۔ پل بھر میں رہبر اور دوسرے پل رہزن بنا دینا ان کے لئے مشکل نہیں ہے۔ کوئی ہمدردی کے بول سنا دینا ہے۔ سندر سپنا دکھا دیتا ہے اور معمولی سا غیر اہم عہدہ دے دیتا...... ہے اور لوگ مبارکبادیوں اور شکریوں سے کہرام مچا دیتے ہیں کیا کبھی پچھڑوں اور ہریجنوں کو بھی مبارکبادیوں، شکریوں اور احسانات کا ایک جملہ کہتے ہوئے سنا ہے؟ وہ جانتے ہیں کہ کسی نے ان کا حق دیا ہے خیرات نہیں۔ لیکن تمہارا سماج زندگی سنوارنے کی بجائے قبرستان سجانے پر خوش ہوتا ہے۔ جو لوگ کھلونوں سے بہل جائیں ان کے لئے جوکھم اٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟

''سر میرے لئے اب کیا حکم ہے؟'' اکبر بھارتی کے پوچھنے پر آئندہ کا پروگرام بتاتے ہوئے سونے لال جی نے کہا'' تم سڑکوں، پلوں اور اسکول کی عمارتوں کے سنگ بنیاد کی تیاریاں کرو۔ اس طرح ان سے قریب ہونے کا موقع ملے گا اور وہ سمجھیں گے کہ اب وکاس کا کام ہونے والا ہے۔ محرم کا مہینہ قریب ہے۔ تمام اکھاڑوں کو میری طرف سے پورا خرچ دینے اور کرکٹ کی ٹیموں کو بیٹ بلا دینے کا اعلان کردو۔ صرف اتنا ہی کام کرلو پھر دیکھنا لوگ تمام رنجش بھول کر ڈانس کرتے اور میرے نام کی جئے کار کرتے نظر آئیں گے''

اکبر بھارتی اپنا فرض ایمانداری سے انجام دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ

سیاستداں اپنے محلوں سے باہر کھڑے تناور درختوں کی طرح ہوتے ہیں جن کے پھل کھانے کے لائق نہیں ہوتے اور پھول خوشبو سے محروم ہوتے ہیں!

''سر اس بار علاقہ کے اہم آدمی شرافت حسین الیکشن کی تیاری کر رہے ہیں'' اکبر بھارتی نے اپنے خیال میں بہت اہم خبر سناتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایمانداری، اخلاق مندی اور انصاف پسندی کے لئے بہت مشہور اور مقبول آدمی ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے نام پر عوام متحد ہو جائیں گے وہ آپ کے لئے بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''تمہارے لوگ شرافت جیسے شریف آدمی کے نام پر کبھی ایک نہیں ہو سکتے'' سونے لال جی نے۔ بے فکری سے کہا ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنوں پر غیروں کو ترجیح دینا زیادہ پسند کرتے ہیں، انہیں اپنے درمیان سے کسی کے بڑھ جانے میں ہتک، ذلت اور کمتری محسوس ہوتی ہے، دیکھتے نہیں کہ جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں اپنے امیدوار کو کامیاب بنانے کی بجائے ناکام کرنے کے لئے کئی امیدوار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں شرافت حسین کے ساتھ بھی یہی ہوگا''، ''حلقہ کے بااثر اور تعلیم یافتہ لوگ شرافت حسین کا ساتھ ضرور دیں گے'' اکبر بھارتی کی تشویش کے جواب میں سونے لال جی نے کہا ''ہمیں ان کی پرواہ نہیں ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ سارے بااثر لوگ بے اثر ہو چکے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس طرح تمہاری عورتیں پردے میں رہتی ہیں۔ یہ بااثر، شریف اور عزت دار کہلانے والے لوگ بھی حجروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کو اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ سماج کی بہتری سے نہ تو اُن کو غرض ہے اور ظاہر ہے سماج کو بھی ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ان لوگوں کو بہت کچھ بن جانے کی چاہت ہے۔ لیکن کچھ کرنا بھی نہیں چاہئے۔ انہیں اپنی خول میں کڑھنے دو۔ سیاست میں شرافت کی نہیں اکثریت کی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمیں عوام کی اکثریت اور انجام سے بے پرواہ جوانوں کی فوج کامیابی دلائے گی جس کے لئے ہم نے پانسہ پھینک دیا ہے۔ شرافت جی سے ان کے بھائی بندھو نپٹ لیں گے تم ان سے بے فکر ہو کر اپنے کام میں سرگرم ہو جاؤ۔

اسمبلی انتخاب میں کلی چار امیدوار اپنی اپنی قسمت آزمائی کے لئے جدوجہد

کر رہے تھے شرافت حسین اپنی زبردست اکثریت کے بھروسے الیکشن میں امیدوار ہوئے تھے۔ لیکن انہیں اپنی ہی برادری کے دو حریفوں کا زبردست مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ادھر شاطر امیدوار سونے لال جی نے اکبر بھارتی اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے تحریک چلا رکھی تھی کہ اگر سونے لال جی کی متحد ہو کر حمایت نہیں کی گئی تو فاسشٹ پارٹی کا امیدوار کامیاب ہو جائے گا۔ یہ اتنی آزمودہ اور کامیاب چال تھی کہ شکار خود شکاری کے جال میں پناہ لینے آ گیا اور سونے لال جی کو امید کے مطابق شاندار کامیابی حاصل ہو گئی۔ جہاں لوگوں کو انتخاب میں کامیابی کی بے انتہا خوشی تھی۔ وہیں کچھ لوگوں کو اس بات کی خوشی کم نہ تھی کہ وہ شرافت حسین کو ناکام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنے مخالف کی شرمناک ناکامی اور پسندیدہ امیدوار کی شاندار کامیابی پر عوام مسرت و شادمانی سے جھوم رہے تھے اور حلقہ کے مختلف مقامات پر سونے لال جی کی راجدھانی سے واپسی پر شاندار استقبالیہ کی زبردست تیاریاں چل رہی تھیں۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اس بار وہ وزارت میں شامل کئے جائیں گے اور علاقہ میں بڑے پیمانے پر ترقی کے کام ہوں گے۔ لوگوں کی زبان پر سونے لال جی کی تعریف کے کلمات مچل رہے تھے۔ ایسا لیڈر قسمت سے ملا ہے۔ سیکولر...... مہربان...... اور وفادار!

راجدھانی میں حکومت سازی کی قواعد زور شور سے چل رہی تھی۔ کسی ایک پارٹی کو اکثریت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ خرید و فروخت اور توڑ جوڑ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں سیکولر محاذ حکومت سازی میں ناکام ہو گیا اور فاسشٹ گروپ نے جن ممبران کی گردنوں میں اپنی غلامی کا پٹہ ڈال کر حکومت سازی کا دعویٰ پیش کیا۔ ان میں پہلا نام سونے لال کا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ان کا مختصر سا بیان بھی تھا کہ ”میں اس پارٹی کے سدھانت سے دلی لگاؤ رکھتا تھا مگر سیاسی مصلحت کے کارن سیکولر بنا ہوا تھا۔ میں خوش ہوں کہ دیر پا سویرا اپنے گھر میں آ گیا ہوں“

اچانک...... ہاں اچانک جشن کا پر جوش سماں سوگوار ماتمی ماحول میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قیمتی...... بہت قیمتی شے کھو گئی ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے

آنکھ ملاتے ہوئے کترا رہے تھے۔ جیسے انجانے میں ناقابل معافی گناہ سرزد ہوگیا ہو جو لوگ سونے لال کی تعریف کرتے ہوئے تھکتے نہ تھے۔ وہ دھیرے سے کہہ رہے تھے جسے سونا سمجھ رہے تھے وہ کھوٹا نکلا!

☆☆

رشک قمر دولہا

گوری چل اب اپنے دیس
بابل کا گھر اب پرایا لگے!!

حویلی میں عورتیں بابل کے گیت چھیڑے ہوئی تھیں۔ ان کی خوشیوں میں ڈوبی ہوئی مدھر اور سریلی آواز سے ماحول پھر عجب سی حیات بخش اور کیف آور مسرت چھائی ہوئی تھی۔ میزبان بلا وجہ بھی اپنی مصروفیت کا مظاہرہ کرتے پھرتے رہے تھے۔ نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ براتیوں کے درمیان دولہا یوں لگ رہا تھا جیسے ستاروں میں چاند ہو اور ایک نوجوان لڑکا سہرا پڑھ رہا تھا۔

حوروں نے سنوارا ہے جسے رشک قمر دولہا
امی کا پیارا ہے اور ابو کا قلب و نظر دولہا

ماسٹر سلطان بے حد خوش تھے۔ جیسے کائنات کی ایک تہائی دولت مفت ہاتھ آ گئی ہو۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے درمیان بیٹھے تھے اور انہیں ہنس ہنس کر بتا رہے تھے۔ اس دور میں جبکہ لڑکی کی رخصتی ایک جہاد کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور لڑکے پالتو جانوروں کی طرح خرید و فروخت ہو رہے ہیں۔ نکاح ہو جانے کے باوجود مجھے اس شادی پر خواب کا گمان ہو رہا ہے کیونکہ جب علاقہ کے ایک متمول کسان غفور بابو نے اپنی اکلوتی اولاد کے لئے خود ثروت کا رشتہ مانگا تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔ مجھے تو اپنی سماعت پر دھوکے کا گماں ہو رہا تھا۔ علاقے کا ایک بڑا کسان آج

کے دور میں بغیر کسی مطالبے کے ایک غریب ٹیچر کی بیٹی سے اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ مانگے تو کس کو یقین آئے گا، لیکن غفور بابو نے بار بار یقین دلایا تو مجھے اعتماد کرنا ہی پڑا۔ اس دن مجھے اپنی اور اپنی بیٹی ثروت کی خوش نصیبی پر رشک آ رہا تھا۔

دراصل ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے دولت چلی آ رہی ہے۔ ان لوگوں نے دولت کی حفاظت کا انوکھا طریقہ اپنا رکھا ہے۔ وہ لڑکوں کو تعلیم نہیں دلاتے۔ ان کا یقین ہے کہ تعلیم آدمی کو ناکارہ اور فضول خرچ بنا دیتی ہے۔ وہ لڑکوں کو تعلیم دلانے کی بجائے تعلیم یافتہ بہو کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو حویلی کی ذمہ داریوں کے علاوہ حساب و کتاب کا کام بھی سنبھالتی ہے۔ ثروت نے اسی سال میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ہے۔ اسی وجہ سے غفور بابو اپنی اکلوتی اولاد کی شادی ثروت سے کر رہے ہیں۔ گویا یوں سمجھئے کہ ان کے گھرانے میں برطانیہ طرز کی حکومت ہے۔ جہاں اپنی ثروت ملکہ بن کر راج کرے گی۔

ماسٹر سلطان کے بڑے داماد ایک اور رشتہ دار کے ساتھ غصہ آمیز سنجیدگی چہرے پر طاری کئے ہوئے آئے اور کچھ دوری سے ہی اُنھیں بلایا۔ ماسٹر صاحب کا ماتھا ٹھنکا جانے کیا بات ہوگئی۔ ان کی ساری خوشی کافور ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے ان کے قریب پہونچے تو ان کا داماد شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

’’آپ نے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی۔ دولت کی چکا چوندھ نے آپ کو اندھا بنا دیا ہے۔ بیٹی اگر ایسی ہی بوجھ تھی تو اسے زہر دے کر مار دیا ہوتا۔ مگر زندگی بھر کے لئے آنسوؤں کی سوغات نہ دیتے۔‘‘

’’آخر ہوا کیا ہے؟‘‘ ماسٹر صاحب دھاڑے ’’صاف صاف بتاؤ باؤنڈری مت باندھو‘‘۔ ’’وہی ہو رہا ہے جو اَب ہونا ہے یعنی دولہا محفل میں لوگوں کی آنکھ بچا کر بیڑی پی رہا ہے‘‘۔

داماد کی رپورٹ سن کر ماسٹر صاحب کے دل کا بوجھ اتر گیا اور وہ اس پر برس پڑے۔

’’بیڑی ہی پی رہا ہے نا شراب تو نہیں پی رہا ہے۔ تم شروع سے ہی اس سے جلتے ہو۔ تم سے وہ لاکھ درجہ بہتر ہے۔ تمہاری طرح اقلیتی اُردو اسکول کا ٹیچر نہیں ہے۔ جس کو سال سال بھر

تنخواہ نہیں ملتی اور قرض پر گزارہ ہوتا ہے۔ اس کے کھیتوں کا رکھوالا اور مزدور تم سے بہتر اور سکون کی زندگی بسر کرتا ہے'' ماسٹر صاحب کی تقریر ابھی شاید ختم نہ ہوئی مگر سمدھی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے ان کی طرف بڑھ گئے اور ان کا بڑا داماد اپنی...... قسمت کا ماتم کراہوا...... کی طرف بڑھ گیا۔ وُہ سوچ رہا تھا کہ اقلیتی اسکول کا ٹیچر ہونے کی بجائے کسی زمیندار کا منیجر یا مزدور ہوتا تو شاید مقروض کی زندگی کا عذاب جھیلنے کی بجائے اپنے خاندان کو بہتر آرام دے سکتا تھا۔

بارات صبح آئی تھی اور شام سے پہلے رخصت ہوگئی۔ شامیانہ ہٹا دیا گیا تھا اور چند مہمان نیم کے پیڑ تلے بیٹھے اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ اگر سب لوگ بابو غفور کی طرح عالی ظرف، مذہبی اصول پر کاربند اور حرص وہوس سے مبرا ہوتے تو بیٹیاں واقعی رحمت ہوتیں۔ جس سے سارا سماج مستفید ہوتا کیونکہ خدا کی اس رحمت سے کوئی محروم نہیں ہے۔

دلہن ماروتی سے میکے آتی ہیں۔ مگر ثروت ٹریکٹر پر سسرال سے آئی تو قصبہ میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ قصبہ میں اس کا ٹریکٹر یوں داخل ہوا جیسے فاتح فوج کا ٹینک ہو۔ اس کے بے ہنگم شور کو سن کر سب لوگ دوڑ پڑے۔ پہلی بار کسی دلہن کو ٹریکٹر میں آتے دیکھ کر انہیں تعجب بھی ہو رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ دولہا ٹریکٹر پر خود ہی جلوہ گر تھا۔ دولہا انجن بند کر کے دالان میں جا کر بیٹھ گیا اور لڑکیوں کی معنی خیز مسکراہٹوں کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے ثروت نے انہیں ٹوک دیا۔ ''آخر تم سب کس بات پر لگاتار قہقہے برسا رہی ہو''۔

''دلہنیں کار پر آیا کرتی ہیں'' ایک لڑکی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

مگر ٹریکٹر پر تو پہلی بار...... ہاہاہا!!!

''کرایہ کی ماروتی پر آتی ہیں تو بڑے فخر کی بات ہوگئی اور میں اپنے ٹریکٹر پر آئی ہوں تو ہنسی آ رہی ہے بیوقوف!''۔

لڑکیوں کی حرکت پر ثروت کو تاؤ آ گیا۔ جس کو وہ حقارت سے دیکھ رہی تھیں دراصل وہ تو فخر کی بات تھی۔ ثروت کو اپنے مقدر پر ناز تھا۔ یہ تو اس کی خوش نصیبی تھی جو اتنے مالدار گھرانے میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ لوگ اس کی تعریف کریں

گے، لیکن لڑکیوں کی احمقانہ حرکت پر اسے چند لمحوں کے لئے دکھ ہوا تھا، لیکن اس خیال سے فوراً جھٹکارا حاصل کرلیا اور اس کے چہرے کا گلاب پھر کھل اٹھا اور خوشبو بکھیرنے لگا۔

ثروت کی ڈانٹ سن کر لڑکیاں خاموش ہوگئیں۔ مگر ان کے خوبصورت ہونٹوں سے تبسم جدا نہ ہوا۔ ثروت کو چھوڑ کر وہ دولہا کو اپنی شرارت کا نشانہ بنانے کے لئے کمرے سے نکل گئیں۔ دولہا دالان میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے کہنے پر وہ حویلی میں جانے کے لئے ان کے ساتھ ہولیا۔ وہ اس طرح شرماتے لجاتے ہوئے حویلی میں داخل ہوا جیسے دلہن حجلۂ عروسی میں جاتی ہیں۔ آنگن میں پلنگ کے فریم پر قیمتی چادر بچھادی گئی تھی۔ جس پر بیٹھتے ہی دولہا چاروں خانے دھڑام سے چت ہوکر گر پڑا۔ چاروں طرف سے قہقہوں کا سیلاب سا امل پڑا۔ دولہا کی حالت قابل دید تھی۔ عجیب منظر تھا۔ پان کی پیک سے منہ بھرا ہوا تھا جس نے اس کے گرتے ہی اچھل کر کپڑوں پر گل بوٹے بنادیئے تھے۔ وہ خود اٹھ جانے کی بجائے پلنگ کے فریم میں چت پڑا ہوا ثروت کو مدد کے لئے پکار رہا تھا اور لڑکیاں تالیاں بجاتے اور قہقہہ لگاتے پلنگ کا طواف کررہی تھیں۔ ان کے قہقہے تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ معاً قہقہوں کا شور سن کر ثروت کو لڑکیوں کی شرارت کا خدشہ محسوس ہوا۔ وہ تیزی سے کمرے کے اندر سے نکل کر آنگن میں آئی تو اپنے دولہا کی بے بسی کا منظر دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر دولہا کو باہر نکالا اور لڑکیوں پر غصہ اتارنا چاہا مگر وہ تو رفو چکر ہوچکی تھیں۔

ثروت نے دولہا کا پان کے داغوں سے مزین لباس تبدیل کرایا اور اس کو کمرے میں ہی رہنے کی ہداتے کر کے خود نل پر آکر کپڑے سے پان کا داغ دھونے لگی، لیکن کھیت، کھلیان اور کھلے میدانوں میں اڑنے والے پنچھی کو کمرے کے پنجرے کی تنہائی میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ آنگن میں سناٹا دیکھ کر ثروت کے قریب چلا آیا اور انتہائی معصومیت اور محبت سے التجا کرنے لگا۔ ’’چھوڑ دو نا تمہارا ہاتھ دکھ جائے گا کپڑا لاٹری میں دھلا لیں گے‘‘ ثروت نے کپڑے دھونا چھوڑ کر معنی خیز نگاہوں سے دولہا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت اور محبت کے سوا دوسرا کوئی عکس نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ اب تو زندگی بھر اسی معصوم فرشتے کے نباہ کرنا ہے۔ وہ محبت آمیز نرمی سے بولی۔ ’’لاٹری نہیں لانڈری کہتے ہیں‘‘۔

"نہیں لاٹری کہتے ہیں میری امی تو یہی کہتی ہیں"۔

"میں لانڈری کہتی ہوں۔ اب تم بھی یہی کہو گے"۔

"ٹھیک ہے اب میں بھی لونڈی کہوں گا۔"

"نہیں نہیں...... لانڈ......ری"

"اچھا لونڈری کہوں گا"۔

"اب تم کمرے میں جا کر بار بار اس کو یاد کرو"

ثروت نے دولہا کو حکم دیا اور وہ انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ کمرے میں جا کر لونڈری، لونڈری کی گردان کرنے لگا۔ جسے سنتے ہوئے ثروت کے ہونٹ بلکہ اس کا پورا وجود خوشی سے گدگدا رہا تھا اور وہ کپڑوں سے پان کے داغوں مٹاتے ہوئے یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اپنے مقدر کو چمکا رہی ہو۔ لڑکیاں شادی کے بعد کسی کی ماتحت ہو جاتی ہیں۔ ان کے مرد دنیا بھر میں روزی حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہیں کرتے۔ چند دنوں کی رفاقت اور برسوں کا انتظار اور طویل جدائی کا غم...... لیکن وہ اب زندگی بھر دولت کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرے گی۔ اس کے تبسم ریز ہونٹوں کو کوئی خوبصورت نغمہ چوم رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔

قصبہ کے لڑکے اور لڑکیوں کو ثروت کے دولہا کے روپ اچھا کھلونا مل گیا تھا۔ کوئی لڑکی اسے پان میں رنگ ڈال کر کھلا دیتی تو کوئی جوتا چرا کر اپنے رشتے کا اظہار کرتی تھی اور لڑکے نہایت خلوص سے اپنے بہنوئی کو حلوائی کی دکان اور چائے خانوں میں لے جا کر خوب تواضع کرتے اور بڑی چالاکی سے رفو چکر ہو جاتے۔ بے چارے دولہا کو گھر میں چین تھا اور نہ باہر آرام۔ شاید کوئی اور ہوتا تو تنگ آ کر فرار ہو جاتا۔ مگر چند ہی دنوں کی رفاقت میں ثروت نے کیسا جادو کر دیا تھا کہ وہ سرکس کے جانور کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے لگا تھا۔

ثروت نے حفظ ماتقدم کے طور پر دولہا کو گھر میں رہنے کی تاکید کر رکھا تھا۔ کوئی تاک جھانک کرتی تو اسے بھگا دیتی۔ وہ خود بھی ہر وقت ہوشیار اور خطرے کی بو سونگھتا رہتا تھا۔ اس دن تھوڑی دیر کے لئے حویلی سے باہر نکلا تو لڑکوں نے اسے پھانسنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ نہیں آیا اور ثروت کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے شکایت کرنے لگا۔ "دیکھو سالے

لوگ پھر مجاک کرر ہے تھے"۔

"تم بھی ان سے مذاق کیا کرو"۔

"ہم کو مجاک نہیں آتا سکھا دو نا"۔

"تم ایک دم الو کے پٹھے ہو"۔

پہلی بار ثروت خفگی سے بولی۔ واقعی اس کی بیوقوفی پر اسے غصہ آ گیا تھا۔ مگر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے دولہا کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ مسکین سی صورت بنائے کھڑا تھا۔ ثروت کو اپنی حرکت پر افسوس ہوا۔ انسان چاہے جیسا بھی ہو۔ اس کے بھی جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنائیت سے بولی۔ "اچھا لو" تمہیں روٹھنا بھی آتا ہے کیا میری بات کا بُرا مان گئے؟"

"بُرا نہیں مانیں گے تو اور کیا تم نے مجھے الو کہا ہے۔ میری امی تو ابو کو غصہ میں بیل کہتی ہیں"۔

"اور امّی کو تمہارے ابو کیا کہتے ہیں"۔

"میرے ابو امی کو بھینس کہتے ہیں اور دونوں ہنسنے لگتے ہیں"۔

"اچھا......تو اب میں بھی تم کو بیل کہا کروں گی مگر تم مجھے کیا کہو گے؟"

ثروت کا قہقہوں کا ترنم میں لپٹا ہوا جملہ سن کر دولہا کے چہرے پر بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے یوم پیدائش سے ہی اس جملے کو سننے کی آرزو دل میں بسائے ہوئے تھا۔ اس نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تم گوری چٹی ہو اس لئے میں تم کو غصہ آئے گا تو گائے کہوں گا"۔

اور پھر ترنم ریز ہنسی سے سنگیت کی لہریں پھوٹ پڑیں!

"ٹریکٹر کے حساب میں اپنے ابو کے نام پر پانچ سو روپیہ بقایا لکھ دو"

سسرال سے آئے ہوئے ثروت کو چند دن ہو گئے۔ جب دولہا نے ایک ڈائری بڑھاتے ہوئے کہا تو اسے یاد آیا کہ ماسٹر صاحب نے ٹریکٹر سے کھیتوں کی جوتائی کرائی

تھی۔ ثروت نے ڈائری لیتے ہوئے سوچا۔ دولہا کے آباواجداد کتنے دوراندیش تھے جنہوں نے دولت کی حفاظت کا انوکھا اور آسان طریقہ اپنا رکھا ہے۔ دولت ہی تو زندگی ہے۔ دولت کے بغیر آدمی مشین کے ناکارہ پرزے کی طرح ہوتا ہے۔ اس نے دولہا کی طرف ڈائری بڑھاتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ سجا کر کہا۔

’’تم واقعی بیل ہو!‘‘

’’اور تم سچ مچ گائے ہو!!‘‘

اور ان کے طربناک قہقہوں سے کمرے کی ہر شے سے جلترنگ کی دھن نکلنے لگی!

☆☆

تن کے اُجلے من کے کالے

مدتوں بعد رحمان کی آمد پر حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوئی تھی۔! کبھی میرے دوستوں کی فہرست بہت طویل ہوا کرتی تھی، لیکن اب صرف فہرست اور یادِ ماضی کا عذاب میرے پاس ہے۔ میرے دوستوں میں رحمان سب سے قریب اور عزیز تھا۔ ہماری دوستی بہت مشہور تھی۔ انہیں ہماری دوستی پر رشک آتا تھا۔ واقف کاروں کو غلط فہمی ہے کہ ہم اب بھی دوست ہیں اگرچہ ہمارے دلوں میں دوسرا خیال نہیں آیا ہے۔ مگر حالات نے قربت کو دوری میں بدل دیا ہے۔ بلندیوں پر پہنچ کر جب لوگ والدین سے دور ہو جاتے ہیں تو دوستی کیا چیز ہے۔ بہرحال کو دیکھا تو ماضی کا آئینہ سامنے آگیا اور کتنے ہی چہرے مسکرانے لگے تھے۔

رحمان اُردو ٹرانسلیٹر کے عہدہ پر سرکاری ملازم ہے ہمارے سماج میں سرکاری افسران کی کمی کے باعث معمولی سرکاری ملازم بھی دوسرے سماج کے اعلیٰ افسران کی نقالی کرتے ہیں۔ رحمان اپنے سماج کے سرکاری ملازم کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس کی پوشاک، حرکات وسکنات اور انداز بدل کر رہ گئے تھے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہی رحمان ہے۔ جس کی انکساری اور سادگی کے لوگ گرویدہ تھے۔ اس نے اپنے حالات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔

''دراصل میں اپنی لڑکی کے معقول رشتہ کے لئے بہت پریشان ہوں معلوم ہوا ہے کہ پڑوس کے گاؤں میں ایک لڑکا ماسٹر کے عہدے پر بحال ہوا ہے اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف سرکاری ملازمت کی اہمیت ہے، لیکن لڑکے کے باپ کا دماغ چھوتے طبق پر ہے۔ کسی کو پیٹھ پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیتا ہے۔ درجن بھر لڑکویں کو دیکھ چکا ہے۔ مگر اپنے

چاند کے ٹکڑے کے لئے کوئی حور پسند ہی نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس کے دل میں کوئی چور چھپا ہے۔ پولس لات سے اور تم لیڈر بات سے پوشیدہ راز اگلوانے میں بڑے ماہر ہوتے ہو۔ مجھے یقین سا ہے کہ اگر تم میری مدد کر دو تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔“

”پہلی بات یہ کہ میں خود کو لیڈر نہیں سمجھتا“ حالانکہ اس نے لیڈر کہا تو مجھے روحانی مسرت ہوئی تھی۔ پھر بھی انکساری کی اداکاری کرتے ہوئے میں نے اس کے جواب میں کہا ”ہمارا سماج کسی کو لیڈر نہیں مانتا البتہ اتنی آزادی دے رکھی ہے کہ آپ خود فرضی آل انڈیا کمیٹی کے قومی صدر بن جائے ں تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہے۔ بہرحال تمہاری خدمت کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں“۔

”لڑکا دیکھنے کی تاریخ طے کر کے خبر کروں گا تم ضرور آؤ گے“۔

”اطمینان، رکھو میں وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

میں نے مہمانداری کی تقریب میں اپنی شرکت کا وعدہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔

بارات تو اجڑے ہوئے بازار کا یک طرفہ جشن ہوتی ہے۔ جبکہ مہمان داری کی تقریب میں میزبان دسترخوان سجانے میں اپنا دل بچھا دیتے ہیں۔ مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کے لئے اسے جال بچھانا بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں جس وقت محفل میں شریک ہوا مہمان دسترخوان کا احاطہ کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاید انہیں میراانتظار تھا۔

”محترم ہم لوگوں کی آمد کے مقصد سے تو آپ واقف ہی ہیں“ لڑکی کے ماموں نے کام و دہن سے فارغ ہونے کے بعد رسمی گفتگو کو مطلب کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

”ماسٹر صاحب کی شادی کے لئے آپ کا کیا پروگرام ہے؟!“

”ہم لوگ رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں“ لڑکا کے محترم والد جو دیندار شخصیت تھے۔ انہوں نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔

”تلک کی مخالفت، بے جا اصراف اور تلک کی رقم سے اپنی جھوٹی شان کی نمائش کرنے والوں کو ہم نصیحت کیا کرتے ہیں، میرے لڑکے کی شادی ایسے لوگوں کے منہ پر

طمانچہ اور عوام الناس کے لئے رہنما ثابت ہوگی۔ میں مہذب خاندان کی تعلیم یافتہ اور قبول صورت دلہن کا خواہش مند ہوں۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔''

اگر اور بھی کوئی بات ہو تو ...... ماموں نے کریدنا چاہا اور کہا۔ معاملات صاف ہوں تو غلط فہمی نہیں ہوتی ورنہ اکثر دلوں میں کوئی بات رہ جانے سے تکلیف اور تکرار کا باعث بن جاتی ہے۔

''میرے خیالات کے واضح اظہار کے بعد بھی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے؟!'' محترم نے بڑی خوبصورتی سے موضوع گفتگو کو ختم کرتے ہوئے کہا اور پھر دوسری باتیں ہونے لگیں۔

ہم لیڈروں کو دنیا بے ایمان کہتی ہے اور بدنام کرتی ہے۔ اگرچہ اس شعبے میں صرف ایمان ہی حرام ہے۔ پھر بھی اس حمام میں ہم تنہا نہیں ہیں۔ اگر ہم زبان کو آزاد کر دیں تو ایمان اور عزت کی نمائش کرنے والوں کی دنیا میں زلزلہ آ جائے گا۔ میں نے کتنے ہی پارساؤں کی پارسائی کو پیسوں کے پانی میں ڈوبتے دیکھا ہے۔ بہر حال محترم کی وضاحت قابلیت کی آئینہ دار تو تھی، لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ معمولی سے فرزند کے لئے کوئی لڑکی پسند کیوں نہیں آ رہی تھی؟ ذہن میں یہ سوال بار بار مچل رہا تھا۔ میں نے اپنی دنیا کا آزمودہ نسخہ آزمانے کا فیصلہ کیا اور محترم کو طبّی فوائد سے بھرپور نیم کے پیڑ تلے لے گیا اور رازداری سے انہیں بتایا۔

''میں رحمان کی دعوت پر ضرور آیا ہوں۔ مگر صرف اس کا طرفدار نہیں ہوں۔ میں عوامی آدمی ہوں، میرے لئے آپ دونوں برابر ہیں۔ رحمان میں یوں تو کوئی کمی نہیں ہے۔ پہلی بیٹی کی شادی میں وہ ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ وہ اپنے مرتبے اور میعار کے مطابق خود ہی کثیرِ رقم خرچ کرنا چاہتا ہے۔ اس رشتہ پر تلک کی تہمت عائد نہیں ہوگی۔

آپ کی نیک نامی اور پاکدامنی پر حرف آنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ کے معیار اور پسند کے مطابق معقول رشتہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اسے قبول کر لیجئے۔''

''بہتر ہوگا کہ رحمان صاحب کو بھی بلالیں'' محترم نے میری تجویز بغور سننے کے

بعد کہا ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں، لیکن برف پگھلنے اور اپنی کامیابی کے امکان کا اندازہ کرکے مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔

''آپ لوگوں کی تجویز نے مجھے شدید الجھن میں ڈال دیا ہے'' رحمان کی آمد کے بعد محترم نے میری تجویز کے جواب میں کہا۔ ''دنیا جانتی ہے کہ میں تلک اور شادی میں نمائش کا سخت مخالف ہوں۔ مگر آپ اپنی بیٹی داماد کو جو کچھ دینا چاہتے ہیں اس کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ مجھ پر تلک یا کسی مطالبے کا الزام عائد نہیں ہوگا، لیکن رازداری اہم شرط ہوگی اور شادی کا پروگرام میری مرضی پر منحصر ہوگا''۔

''آپ کی تمام شرائط ہمیں بخوشی قبول ہیں'' بیک زبان ہمارے اقرار کے بعد محترم نے شاید پہلے ہی سے مرتب کردہ اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''آپ لوگ اس قدر مجبور کر رہے ہیں تو پروگرام اس طرح ہوگا کہ لڑکے پر خرچ کی رقم پہلے مجھے دیدیں۔ لڑکے کے لوازمات میں خود خرید لوں گا اور لڑکی کے سامانوں کی خریداری آپ کر لیں۔ اس طرح یہ اہم کام خوش اسلوبی سے انجام پذیر بھی ہو جائے گا اور ہماری عزت پر حرف بھی نہیں آئے گا۔ بلکہ میری خواہش کے مطابق یہ تقریب مثالی اور قابلِ تعریف بھی کہلائے گی، لیکن یہ راز کسی قیمت پر ظاہر نہیں ہونا چاہئے''۔

''یہ راز قیامت تک ہمارے سینوں میں دفن رہے گا۔''

آثار قیامت سے روبرو ہونے کے باوجود ہم نے رازداری کا حلف لیا اور شاداں، کامراں اور فرحاں محفل میں پھر آ گئے۔ ہمیں اپنی فتح مندی نے مسرور کر دیا تھا۔

ماسٹر صاحب کے محترم والد گلنار چہرے پر مسلسل مسکراہٹ سجائے میر محفل بنے ہوئے تھے۔ خواب سے بہتر تعبیر ملی تھی۔ اب تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آ رہی تھی اور اب لڑکی دیکھنے کی رسم کو غیر شرعی، وقت کا زیاں اور اسراف بے جا قرار دے رہے تھے اوپر کی جیب سے بخشی جنتری نکال کر روز سعید کا انتخاب کرنے کے بعد شادی کا پروگرام بتاتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

''۱۹ر جون جمعہ مبارک ہے۔ بعد نماز جمعہ نکاح مسنونہ ہوگا۔ اگر توفیق ہوگا تو

صرف دس براتیوں کو کھانا کھلا دیں گے۔ بعدازاں رخصتی ہو جائے گی۔ اگر اس پروگرام میں کوئی ترمیم کرنا ہو تو آپ کو اختیار ہے"۔

"آپ کے خیالات اعلیٰ، پاکیزہ اور شرع کی روشنی سے معمور ہیں" ہمارے علاوہ تمام لوگوں نے اس پروگرام کو صرف منظور ہی نہیں کیا بلکہ دیر تک محترم کی مدح سرائی بھی کرتے رہے۔ ہوس پرستوں، سے بھری اس دنیا میں ایسے خدا پرست، اصول پسند اور انسانیت کے نمونے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ہم نے اپنی کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا اور شادی میں شرکت کا وعدہ لے کر رحمان رخصت ہو گیا!

تقریب نکاح سادگی، اخلاق اور اخلاص کا نمونہ تھی۔ بڑا روح پرور اور ایمان افروز منظر تھا۔ مسجد کے صحن میں لوگ اس طرح بیٹھے تھے۔ جیسے فرشتے غیر معمولی عبادت میں مصروف ہوں۔ اگر یہ حقیقت بھی ہوتی تو الٰہی تقریبات عبادت سے کم نہ ہوتی، لیکن ہوس پرست اور مفاد پرست اصولوں کو پامالی کرنے اور دنیا کو ہی نہیں خدا کو بھی دھوکا دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

"آپ لوگ میری شرافت، خلوص اور قربانی کا مذاق اڑا رہے ہیں" قبولیت کے الفاظ سماعت سے ٹکراتے ہی محترم چیخ اُٹھے اور انتہائی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے مسجد سے باہر نکل گئے اور دالان میں جا کر بیٹھ گئے۔ فرشتوں کی جماعت لمحوں میں آدمی کے ہجوم میں بدل گئی۔ میزبان گھبرا گئے، لیکن میں مطمئن تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرا منتر ان کا بھوت اتارنے کے لئے کارگر ثابت ہوگا۔ میں بھی دالان میں چلا گیا اور ان کے قریب بیٹھ کر حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے جس اخلاق اور کردار کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کی محافظت بھی ضروری ہے۔ رحمان نے تین لاکھ کی کثیر رقم خرچ کی ہے، لیکن آپ محض پچاس ہزار روپیہ کی معمولی رقم وہ بھی ادھار دین مہر پر اتنے برافروختہ ہو گئے ہو کیا یہ مناسب ہے؟"

"آپ کا کہنا درست ہے، لیکن مہر میں اتنی بڑی رقم سے لوگ کیا اندازہ لگائیں گے"۔

"لیکن اگر بات بڑھے گی اور راز کھل جائے گا تو ہماری عزتوں کا کیا ہوگا؟!"

میرا تیر ٹھیک نشانے پر پیوست ہوگیا۔ محترم نے ایک پل میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور جس طرح محاصرے میں گھرا ہوا سپاہی ہتھیار ڈال کر خود کو دشمن کے رحم و کرم کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے مسجد میں آ گئے اور نکاح کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے فرشتوں کی جماعت عبادت کے بعداب دعا مانگ رہی ہو۔

* *

بیوقوفی زندہ باد

ٹرین حسب دستور لیٹ تھی۔ بس پر کسی مسافر کو اعتراض تھا، غصہ تھا اور نہ شکایت تھی۔ لوگ ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں اور کسی تبدیلی اور بہتری سے مایوس ہو کر جو کچھ ہو رہا ہے اسے قبول کر کے جئے جا رہے ہیں کیونکہ زندگی بہت اہم ہے اور ہر حالت میں زندہ رہنا بھی بہت ضروری ہے۔

پلیٹ فارم پر انتہائی بوجھل، غیر دلچسپ اور بور کن ماحول تھا۔ بنچوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں میں کسی پر غنودگی طاری تھی اور کوئی خراٹے لے رہا تھا۔ جن کو کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل سکی تھی وہ بک اسٹال، خوانچہ والوں اور دیگر سامان فروخت کرنے والوں کا معائنہ کرتے پھر رہے تھے۔

اچانک ریلوے میدان کی طرف سے کسی مجمع باز مداری کی چیختی ہوئی آواز سکوت کا سینہ چاک کرتی ہوئی فضا میں گونجنے لگی۔ جسے الیکشن کے اعلان سے زندگی کی یکسانیت سے اکتائے ہوئے مایوس عوام کے دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور بڑے لوگوں کے درشن پانے اور کبھی نہ پورا ہونے والے خوابناک امیدوں کے دلفریب بول سننے کی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح مسافروں کو بوریت اور اکتاہٹ سے نجات پانے اور وقت گزارنے کے لئے مفت کا تماشہ مل جانے کی خوشی ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے مداری کی آواز کی سمت میں بڑھنے لگے۔ جہاں وہ اچھل کود کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

ٹھہر جاؤ! ٹھہر جاؤ!
ابھی نہیں! ابھی نہیں!!

ریلوے میدان میں سانپ کی شکل اور سائز کا سائیکل کے ٹائر کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا

تھا۔ اور ایک ننگ دھڑنگ مداری اس کے گرد اس طرح اچھل کود اور چیخ رہا تھا جیسے وہ ٹائر کا ٹکڑا ابھی سانپ میں تبدیل ہو کر اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ وہ اپنی ساحرانہ حرکتوں سے سانپ کو وجود میں آنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کرر ہا تھا اور مسافر اس کے گرد اکٹھا ہو رہے تھے۔ جینے کا سلیقہ آتا ہو یا نہ ہو مگر کسی مداری کا تماشہ دیکھنے دیکھنے کے لئے حلقہ باندھ کر کس طرح کھڑا ہونا چاہئے۔ شاید یہ سلیقہ انہیں پیدائشی طور پر معلوم تھا۔ جیسے ناانصافی، حق تلفی اور ظلم سہنے کی عادت ہے۔

پچھلے پہر کی آخری ٹرین سے گھروں کو واپس لوٹنے والے چھوٹے وکیل مقدمے باز، کلرک، چپراسی، بیوپاری اور میٹنی شو دیکھنے والے نوجوان مداری کے گٹھیلے جسم کو رشک اور ٹائر کے ٹکڑے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جو ابھی سانپ میں تبدیل ہونے والا تھا۔ ناممکنات پر یقین رکھنے والے یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں۔ کتنے مداری کیسے کیسے فریب دیتے ہیں۔ مگر یہ مسلسل دھوکا کھانے کے باوجود امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ شاید اس بار سچ ہو جائے!

لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر مداری کا سینہ پھول گیا۔ اس نے انسانی کھوپڑی ایک دوسری ہڈی سے تین بار ٹھوکنے کے بعد فضا میں ہڈی سے زائچہ بنا کر زیرِ لب منتر کا جاپ کیا اور ڈگڈگی بجانے اور مجمع کے حصار میں گھومنے کے بعد درمیان میں کھڑا ہو گیا اور اپنے کرتب کی ابتدا کرتے ہوئے پارٹ دار آواز میں کہا۔ شاعر بولتا ہے۔

قدر بلبل کی جو عاشق ہے وہی جانے صیاد کیا جانے
تڑپ بسمل کی جو لیلیٰ ہے وہی جانے جلاد کیا جانے

ہندو بھائی کو رام رام اور مسلمان بھائی کو سلام!!

”میرے مہربانو! میرے قدردانو!! آپ لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں مداری، بھکاری اور ٹھگ ہوں۔ جو کرتب دکھا کر ہاتھ پھیلائے گا اور بھیک مانگے گا۔ نہیں! نہیں!! ہرگز نہیں! میں تھوکتا ہوں ایسے لوگوں پر جو بغیر محنت مشقت دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اصلی مالک کو چھوڑ کر نقلی آقاؤں سے آس لگاتے ہیں اور دھوکا کھاتے ہیں۔ اپنا ہاتھ

توصرف اس مالک کے آگے پھیلتا ہے جو چاہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ پھٹے حال کو راتوں رات منتری اور منتری کو سنتری کے حوالے کرتا ہے۔ ہر روز یہ تماشہ ہوتا ہے پھر بھی مورکھ انسان اپنی حرکت سے باز نہیں آتا ہے''۔ وہ جملوں کی معنویت کے اعتبار سے اداکاری کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

''میں کیا بتاؤں میرے بھائی دیش کی جنتا کا کیا حال ہے۔ دیش تو مالا مال ہے۔ مگر دیش کا یہ مالک کنگال ہے۔ بھوک سے نڈھال ہے۔ بیکاری سے پامال ہے۔ اور مہنگائی سے اس کا بڑا حال ہے۔ اس کی جھولی خالی ہے مگر یہ دیش کا مالی ہے۔ اس کی تقدیر بھی نرالی ہے۔ خود تو بھکاری ہے۔ مگر منتری اس کے در کا سوالی ہے۔ وہ سرکار بناتی ہے اور بھوک سے چلاتی ہے تو لاٹھی کھاتی ہے۔ الیکشن پیریڈ میں ان کی بڑی شان ہے۔' وہ دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑ کر سرگوشیوں میں کہتا ہے۔'' اسی لئے تو میرا بھارت مہان ہے!''

''قہقہوں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔'' شانتی! شانتی!! وہ بہت سنجیدگی سے کہتا ہے میرے بھائی تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔ اپنی حالت پر رونے کے بدلے ہنستے ہو۔ یہ بھی اچھا ہے کہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع دینے کی بجائے خود ہنس لیتے ہو۔ خیر خیر اب میری بات غور سے سنو اب میں کام کی بات اسٹارٹ کرتا ہوں۔

میرے مہربانو...... ڈگڈگی...... میرے قدردانوں! بھگوان کی کرپا سے میں بھی ڈاکٹر انجینئر اور پروفیسر ہوتا۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو غریبوں، جاہلوں، مزدوروں کی آنکھوں میں سپنوں کی دھول جھونک کر دھرم اور ذات کے نام پر لوگوں کو پاگل بنا کر لیڈر اور منسٹر ہوتا، لیکن میں نے اپنا شاندار فیوچر عیش و آرام کو لات مار کر اور گاندھی بابا کو گرو مان کر دیش واسیوں کی سیوا کے لئے اپنا جیون دان کر دیا ہے۔ بابا نے دیش کو آزاد کرایا تھا۔ اور میں نے دیش واسیوں کو ان کے خطرناک دشمن سے مکتی دلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے، لیکن معاف کرنا مہربان اپنے دیش میں ہم جیسے اصلی سیوک کی قدر نہیں ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ بھارت کی دھرتی پر ہم جیسے گنوانوں کو بھیج کر بھگوان بھی پچھتاتا ہوتا۔''

مداری کی منشا کے مطابق مجمع اس کی سحر طراز باتوں کے طلسم میں گرفتار ہو کر رہ گیا

تھا۔ مداری کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ توا گرم ہو چکا ہے اور روٹی سینکی جا سکتی ہے۔ اس نے مجمع کا چکر لگاتے اور ڈگڈگی بجاتے ہوئے پوچھا ’’پہلے سانپ کا کھیل دکھاؤں یا خطرناک دشمن سے آگاہ کروں؟!‘‘

’’پہلے خطرناک دشمن سے خبردار کرو‘‘

بہت ساری پرجوش آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ جو مداری کی آرزو بھی تھی۔ وہ لوگوں کو مزید متاثر اور سحر زدہ کرنے کے لئے آنکھ بھوؤں چمکانے اور جسم کو توڑ مڑور کرنے لگا۔ پھر تین بار تالی اور ڈگڈگی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کسی منتر کا جاپ کرنے لگا۔ کچھ اس طرح کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آکاش باندھو پاتال باندھو، پورب پچھم باندھو جئے سائیں بابا۔ جئے جئے گاندھی بابا...... دشمن کا ناش کرو اور سارے جگ کو پاک کرو...... تیرے نام کا ڈنکا بجتا رہے اور اس فقیر کا کام سدا چلتا رہے۔‘‘

منتر کا جاپ ختم کرنے کے بعد اس نے بند آنکھیں کھولیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تین کٹورے میں لہو تیر رہا ہو۔ وہ جس طرف دیکھتا تھا لوگ اپنے جسموں میں کپکپی محسوس کرتے تھے۔ وہ ایسی حرکتیں کر رہا تھا جیسے کسی انجانی قوت نے اس کے وجود پر قبضہ کر لیا ہو۔ وہ لپک کر ایک آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوا تو اس نے دس روپیہ کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جسے اس نے انسانی کھوپڑی پر دوسری ہڈی سے دبا کر رکھ دیا۔ اور پھر مجمع سے مخاطب ہوا میرے مہربانو! سنت، مہنت، دربار اور مزار پر بغیر چڑھونا اور نذرانہ کے مراد پوری نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں دعائیں اور آشیرواد بکتے ہیں، لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں جو صرف باتیں بناتے ہیں اور راج بھوگ کرتے ہیں۔ میں آپ کا سچا سیوک ہوں اور میرا سدھانت دنیا سے نرالا ہے۔ اب میں بنیادی باتوں کی طرف آ رہا ہوں۔

میرے قدردانوں! دیش کی سیماؤں پر حملہ آور دشمن کو تم پہنچانتے ہو مگر اپنے شریر میں چھپے ہوئے خطرناک دشمن سے لاپرواہ ہو۔ جو تمہاری زندگی اور ہر خوشی کا شترو ہے۔ اس سے خبردار کرنے اور مکتی دلانے کے لئے مجھے آپ کی قسمت، آپ کی تقدیر اور آپ کی خوش نصیبی آپ کے شہر میں کھینچ لائی ہے۔

میری پرارتھنا ہے کہ جو بھائی اپنے خطرناک دشمن سے مکتی پانا چاہتے ہیں اور اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ تلیا مسان پر دس روپیہ کا نوٹ جلد سے جلد چڑھائیں۔ کام ختم ہونے پر آپ کی مرضی اور خوشی سے رقم لوٹا دی جائے گی۔ سماج کی بھلائی کا جھوٹا وعدہ کر کے اپنا کام نکالنے والوں کی طرح آپ کا یہ سیوک دھوکے باز نہیں ہے۔ جلدی کیجئے تلیا مسان جاگا ہوا ہے۔

جلدی کیجئے تلیا مسان جاگا ہوا ہے۔ سوچئے مت ایسا گولڈن چانس جیون میں بار بار نہیں ملتا ہے...... جلدی کریں بخت بہت کم ہے...... آپ کی ٹرین آنے ہی والی ہے جلدی مہربان...... جلدی...... ورنہ جیون بھر پچھتانا پڑے گا...... قدردان جلدی کریں...... جلدی!

لوگ مداری کی سحر طرازیوں میں اس طرح اسیر ہو کر رہ گئے تھے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ تلیا مسان پر دھڑا دھڑ نوٹ چڑھا رہے تھے۔ جیسے بہت ہی دشمنوں میں گھرے ہوں جن سے نجات پانا ضروری ہو۔ تھوڑی دیر میں نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مداری نے نوٹوں کو ایک گندے تھیلے میں ٹھونسا اور دوسرا تھیلا اٹھا کر مجمع سے پھر مخاطب ہوا جو کرشمائی منظر دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔

میرے مہربانوں! کہتے ہیں شریر میں شکتی ہے تو موج ہے مستی ہے۔ دنیا میں شکتی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ شکتی مان امریکہ کے سامنے ساری دنیا بکری ہے۔ جس دیش کا ناگرک کمزور ہوگا۔ وہ دیش کمزور ہوگا۔ اس لئے منش کے خطرناک دشمنوں کا ستیاناس کر کے طاقتور اور ہیلدی سماج کے نرمان کا میں وچن لئے ہوا ہوں اور صرف سیوا کی بھاؤنا سے اپنا سکھ تیاگ کر شہر شہر بھٹک رہا ہوں۔ اس لئے میرے مہربانوں اور قدردانوں غور سے سنو!

جس طرح غدار دیش کا نمک کھا کر غداری کرتے ہیں۔ اسی طرح کیچوے، کرمی اور ہوک ورم آپ کے جسم میں پلتے ہیں اور اسی کو کھوکھلا کرتے ہیں۔ جیسے گھوٹالے باز دیس کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ دیس میں رام نام کی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ لوٹ سکے سو لوٹ کا ہر طرف نظارا ہے۔ ایمان کو دیس نکالا ہے اور بے ایمانی کا بول بالا ہے۔ اصل مال غائب اور نقلی کی بھرمار ہے۔ اس لئے ہم نے نقالوں کو منہ توڑ جواب دینے اور دیس واسیوں کو

ہیلدی بنانے کے لئے ہم نے خاص طور پر دوا تیار کرائی ہے۔ جس کا سیوا کی بھاؤنا سے صرف مختنانہ دام دس روپیہ رکھا ہے۔ دوا استعمال کا طریقہ دوا کے ساتھ ہے۔ وہ جھولا سے دوا کی پڑیا نکال کر اور گھوم گھوم کر بلند آوازیں پوچھنے لگا۔

جن مہربانوں نے تکلیا مسان پر روپیہ چڑھایا ہے وہ اپنا ہاتھ اٹھائیں گے اور جن قدردانوں کو اپنے شریر سے، اپنی زندگی سے اور اپنے بال بچوں سے پریم ہے وہ دس روپیہ نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ جلدی کریں مہربان چمتکاری دوا کا اسٹاک بہت کم ہے...... سوچئے مت ...... گولڈن چانس کا فائدہ اٹھالیجئے ...... ایسا سنہرا موقع پھر نہیں ملے گا...... جلدی کریں...... آپ کی گاڑی بھی آرہی ہے...... یہ کام آپ اپنے لئے ...... اپنے بچوں کے لئے ...... اپنے دیس کے لئے کر رہے ہیں۔ وہ انتہائی تیزی سے دوا کا پیکٹ تھمارہا تھا۔ نوٹ بٹور رہا تھا...... اور جذبات بھڑکانے والی بھاشا بول رہا تھا۔

ٹرین کی آواز سن کر مسافر دوا کی پڑیا سنبھالتے ہوئے اس طرح پلیٹ فارم کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جیسے مقدر سے انہیں نایاب اور قیمتی شے سستے داموں بہ آسانی دستیاب ہوگئی ہو۔ یہ لوگ بھی کتنے معصوم اور بھولے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مگر یہ اصلی نقلی میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔ نقلی پتھروں کی انگوٹھی خرید کر، کسی بہروپئے سے تعویذ اور جنتر لے کر اور کسی کی خوابناک اور پُرفریب باتوں اور وعدوں پر یقین کر کے سوچتے ہیں کہ ان کی قسمت بدل جائے گی۔ سارا دکھ اور بدحالی دور ہوجائے گی۔ شاید انہیں فریب کھاتے کھاتے فریب کھانے کی عادت ہوگئی ہے۔ مگر یہ فریب کھانے اور فریب دینے کا سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا، لوگوں کو سچی خوشی اور خوشحالی کی راہ کون دکھائے گا؟

مداری مطمئن انداز میں اپنے ٹھکانے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ساری دنیا کی توجہ غریبی اور جہالت دور کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ شکر ہے کہ بیوقوفی دور کرنے کی طرف کسی کا دھیان نہیں ہے۔ جس کو بھی بیوقوفی دور کرنے کا خیال آئے گا وہ دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ہوگا کیونکہ سرکاروں، تجارتوں، درباروں اور ہم جیسے مداریوں کا بھرم انہیں کے دم قدم سے قائم ہے!

* *

شہرت اور شاعری

ہم جب تک بقیدِ حیات رہیں گے یعنی زندہ وتابندہ رہیں گے۔ ہمارے دولت کدہ پر مہمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری وساری رہے گا۔ ان کی خاطر وتواضع اور خدمات میں اپنے اسلاف کی روایت کا بھرم قائم رکھتے ہوئے ہمیں اپنے اعلیٰ ظرف اور بہترین اخلاق کا نمونہ پیش کرنا ہی ہوگا۔ مہمان تو مہمان ہی ہوتے ہیں۔ بلا امتیاز ان کی خدمات ہماری ذمہ داری ہے، لیکن دلہن کے میکے سے کوئی آجائے تو پھر کیا بات ہے۔ اگر بھائی ہو تو سونے پر سہاگہ۔ بندہ ہر فکر سے آزاد اور ماحول اخلاص ومحبت سے شرابور ہو جاتا ہے۔ گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ بچوں کے قہقہوں سے سنگیت اور ان کی آواز سے نغمگی برسنے لگتی ہے۔ اور انواع واقسام کے لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہونے کا سنہرا موقع نصیب ہوتا ہے۔ میں نے اپنے چھوٹے سالا کو دالان میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تو خود بخود میرے ہونٹ مسکرانے لگے۔

خیر وعافیت پوچھنے کے دوران وہ خلافِ معمول سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اس کی کیفیت پر میری گھبراہٹ فطری تھی کیونکہ امریکہ کا فنافی البحر ہو جانا اتنا اہم نہیں ہے جتنی سسرال کی چھوٹی سی بات اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی آمد کا مقصد پوچھنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ اس بار اپنے نزول کا مقصد بتانے کے لئے خود اس کے پیٹ میں مڑور ہو رہا تھا۔ دراصل جس کام سے وہ آیا تھا اس میں پہلے پیٹ میں مڑور ہی ہوتا ہے۔ بہر حال اس نے خود ہی اپنی سنجیدگی کا راز عیاں کرتے ہوئے الفاظ کو آواز دی۔

''بھائی جان! ہمارے بزرگوں نے جس صنف کو غلط انداز نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ میں اس کو اپنانے کے خیال سے آپ کے پاس مشورہ لینے آیا ہوں۔ آپ کہانیاں لکھتے ہیں

اور میں شاعری شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔ ادب، سیاست اور محبت میں رقابت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن ہمارے میدان جدا جدا ہیں۔ رقابت اور تصادم کا کوئی خطرہ اور احتمال نہیں ہے۔ آپ سے صرف تخلص کے انتخاب میں تعاون درکار ہے۔ اگر تعاون نہیں بھی کریں گے تو بندہ صرف کسان ہی نہیں اُردو ادب میں اسکالر بھی ہے۔“

”تمہارے حکم سے انکار کی میری مجال کہاں ہے“ اس کی پُرسکون زندگی کے تالاب میں تلاطم نے مجھے بے چین کر دیا۔ اس نے جس کارزار، صحرائے بے کنار اور خارزار راہوں کے سفر کا قصد کر لیا تھا۔ اس میں اپنے اور دوسروں کے حقیقی اوقات کی بربادی کے سوا کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ اس وادی میں زندگی سے مایوس محبت میں مات کھاتے ہوئے نامراد اور ستم رسیدہ لوگ بستے ہیں۔ میں حیران تھا کہ اس کسان کو اچانک یہ روگ کیسے لگ گیا چونکہ شاعری کا جنون تازہ تھا اور ابھی دریا جوش میں تھا۔ لہٰذا میں نے صرف اتنا ہی پوچھنے پر اکتفا کیا۔ ”کاشتکاری کرتے ہوئے تمہیں اچانک شاعری کرنے کا خیال کیسے آیا؟“

”پہلے میرا مقصد اور مدعا سن لیجئے پھر دوسری بات کیجئے گا“ وہ میرے اظہارِ خیال کی آزادی کا...... حق سلب کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کرنے لگا۔ ”ہمارے اسلاف ملاقے کے نامور اور بڑے کسان تھے۔ تقسیم در تقسیم کے بعد بھی ہم لوگ علاقہ میں کسی سے کم نہیں ہیں، لیکن عوامی زندگی میں ہماری اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے درمیان کوئی بڑا افسر، ادیب، صحافی اور شاعری کا معمولی سا رشتہ دار اخباروں میں سماجی رہنما، دین کا خادم، فرشتہ صنعت اور غریبوں کے مسیحا جیسے بہترین القاب کے ساتھ خبریں شائع ہوا کرتی ہیں، لیکن میرے خاندان کے اہم لوگوں کی صفات اور اموات کا چرچا بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے شاعری کے تعلق سے میں نے اپنے خاندان کو گمنامی کے عذاب سے نجات دلا کر شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔“

دریا کی روانی کی طرح اس کے جذبات کی رو جاری تھی اور میں خاموشی سے حیرت زدہ سا اس کے چہرے پر نظر جمائے سوچ رہا تھا کہ جب کسی پر ادب اور شاعری کا جنون طاری ہو جاتا ہے تو اس میں کس طرح تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس کا انداز کتنا خوبصورت

اور گفتگو کتنی مرصع ہو جاتی ہے۔ اس وقت کوئی کسان نہیں بلکہ ابتدائی دور کا شاعر کہہ رہا تھا۔

”دولت سے محدود دائرے میں اہمیت اور عزّت ہوتی ہے، لیکن سیاست ادب اور شاعری میں عزّت اور شہرت کا دائرہ لامحدود ہوتا ہے۔ میں نے سیاست کو اس لئے مسترد کر دیا کہ اس میں عوام کو گمراہ اور مفاد کا فریب دے کر اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔ سیاست ایک ایسی تجارت ہے جس میں پانی میں پونجی لگانا ہے۔ اس میں پانے کا کم اور جانے کا زیادہ احتمال رہتا ہے۔ اس میں اگر دنیا سنورتی ہے تو ”لازمی طور پر عاقبت بگڑتی ہے، لیکن شاعری میں صرف وقت کے زیاں کا احتمال ہے۔ یہ بے ضرر ہے۔ سیاست کی طرح معصوم عوام کے جان و مال کی بربادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بلکہ بیکاری اور بیزاری کے شکار معاشرہ میں شاعری غم بھلانے اور وقت گزارنے کا مفت میں ایک بہترین وسیلہ ہے۔ اُردو سے فیضیاب ہونے والے اور الٹے اُردو پر احسان جتانے والے بے شمار افراد ہیں اگر ایک میرا بھی نام شامل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ دوسروں کی طرح میں بھی اُردو کے ذریعہ شہرت حاصل کر کے اپنا اور خاندان کا نام روشن کروں گا اور اُردو کا خادم کہلاؤں گا۔ اب آپ بتائیے میرا شاندار پروگرام پسند آیا؟“

سالا وہ بھی چھوٹے سالا کی جا و بے جا باتوں کو کوئی بھی شریف آدمی جس کو اس کی بہن سے محبت یا خوف ہوگا ناپسند کرنے کی جرات ہی نہیں کر سکتا۔ لوگ اس کی گالیاں کھا کے بھی بے مزہ ہونے کی بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کو اپنے بھائی کو نظر انداز اور سالی سالوں کو نوازتے دیکھا ہے۔ میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ مجھے شاعری کے جنون میں اس کے مستقبل کی بربادی نظر آ رہی تھی، لیکن اگر کوئی خود اپنی بربادی کا تہیہ کر چکا ہو اگرچہ میرا سالا ہی کیوں نہ ہو اس کو صحیح مشورہ دے کر اپنے گھر کے خوشگوار ماحول میں کشیدگی کا رسک لینا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے اس کے ارادوں کی تقریباً حمایت کرتے ہوئے میں نے پوچھا ”کبھی شاعری کے صحرا میں خاک نوردی اور مغز ماری بھی کی ہے؟!“

”گو کہ شعر کہنا بہت مشکل ہے مگر ذہن رسا اور تک بندی کرنے کی صلاحیت ہو تو بہت آسان بھی ہے“ اُس نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ کسی شاعری کی پسندیدہ غزل سامنے رکھ

لیجئے۔ بار بار پڑھئے۔ ہو سکے تو گنگنائیے بلکہ گنگناتے رہیے۔ اور پھر اس کے متبادل اپنا شعر موزوں کرتے چلے جائیے۔ جیسے کسی کا شعر ہے ۔

میں نے سوچا تھا کہ برسات میں برسے گی شراب
آئی برسات تو برسات نے دل توڑ دیا

میری غزل کا مطلع یوں ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ برسات میں برسے گا اناج
آئی برسات تو سیلاب نے دل توڑ دیا

واہ واہ! بہت خوب واقعی تمہارے وجود میں شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔ ایک ہی شعر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمہارا مستقبل تابناک ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں تمہارا نزول تہلکہ خیز ہوگا اور کسان شاعر کی حیثیت سے تم مشاعرہ لوٹو گے اور شہرت بٹورو گے۔ ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب بیکل اتساہی کے بعد تمہارا نام لیا جائے گا اگرچہ خوش نصیبی سے میرے ساتھ وہ بات نہیں ہے لیکن بیگم کی خوشی سے محروم افراد کے لئے سالا کو خوش کر کے ان کی خوشی حاصل کرنے کے بہترین نسخے کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ پر لطف اور لذیذ کھانوں کی خوشبو ہمیں دستر خوان کی طرف بلا رہی تھی۔

اس رات تخلص کی اہمیت کے پیش نظر اس کے انتخاب کے لئے ہم شب بیداری اور مغز ماری بھی کرتے رہے تھے۔ چونکہ معاملہ چھوٹے سالا کا تھا اس لئے اپنی طرف سے کسی شکایت کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور میں پوری دلچسپی اور توجہ کا اظہار کر رہا تھا۔ ادیب و شاعر کے لئے تخلص کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جو دلکش، دلفریب اور دلنشیں ہونا چاہے کیونکہ تخلیق سے پہلے تخلص مشتہر اور مشہور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے دانشمند کی زحمت اٹھانے کی بجائے صرف تخلص کے وسیلے سے شہرت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں ایسے ادیب و شاعری سے واقف ہوں جنہوں نے اصل ناموں کی بجائے قلمی ناموں سے شہرت ائی ہے جن میں مشہور ادیب شین مظفر پوری اور شاعر جمال ہاشمی کو قریب سے جانتا ہوں ان کا نام اس لئے لے رہا ہوں کہ وقت آنے پر کسی بھی عدالت میں اپنے قول کی صداقت کو ثابت

کرسکوں گا۔ بہرحال اپنی صلاحیت کے مطابق تخلص کی باریکیوں اور اہمیت کے متعلق اپنے سالا کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جگر مرادآبادی اور دل لکھنوی کے تعلق سے جسم کے ہر عضو کا چرند پرند کے نام اور انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے خوبصورت الفاظ بتائے لیکن اسے کوئی تخلص پسند ہی نہیں آرہا تھا۔ ہم پریشان تھے بالآخر جب رات کا شباب اور چاند کی چاندنی ڈھل چکی تو تخلص کا انتخاب کا اہم مرحلہ آسانی سے طے ہوگیا کہ ہمیں اپنی شب بیداری اور مغزماری پر پچھتاوا اور شرمندگی ہورہی تھی۔ بلاتمہید میں آپ کو بتادوں کہ دوسری صبح میرے چھوٹے سالا جمیل احمد اپنی بہن کی سسرال سے کامیابی کے ساتھ اس کے میکے جاتے ہوئے جمیل احمد کسانی سے جمیل احمد جمالیؔ شاعر بن چکے تھے۔

''آپ کا فون ہے'' بیگم نے موبائل تھماتے ہوئے کہا اور بلاتمہید اور ادب لحاظ کا خیال کے بغیر ہیلو کہنے کے ساتھ ہی نوزائدہ شاعر کی بیگم بن بادل کے بجلیاں برسانے لگی۔ ''آپ کو کس جنم کی دشمنی کا انتقام لینا تھا جوان پر شاعری کا بھوت سوار کرکے تباہی اور بربادی کے راستے پر لگادیا ہے۔ خدا کے لئے رحم کیجئے اور شاعری کی لت چھڑانے کے لئے آج ہی ہمارے یہاں آیئے۔ خاندان کے سارے افراد سخت ناراض ہیں۔''

''محترمہ آپ خواہ مخواہ ناراض ہیں'' شاید وہ سانس لینے کے لئے رکی تو میں نے اپنی بے گناہی اور صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''جب وہ میرے پاس آیا تھا تو شاعری کے جراثیم اس کے وجود میں پوری طرح سرایت کرچکے تھے۔ میں بے قصور ہوں میرا مشورہ ہے کہ شاعری بھی دمہ اور کینسر جیسا لاعلاج مرض ہے۔ جو خودغرض دوستوں کی طرح دغا دینے کی بجائے آخری دم تک ساتھ نبھاتی ہے۔ فی الحال کینسر کے مریض کی طرح اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ چھیڑنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ جو بھی ہوگا آئندہ دیکھا جائے گا'' جواب کا انتظار کئے بنا میں نے موبائل بند کردیا، خطرے کا مجھے پہلے سے احساس تھا۔ خاندان کے لوگ روایت شکنی کو بہ آسانی برداشت کرنے والے نہیں تھے۔

تخلص کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے مگر

دھڑکنوں کی زباں سے صرف خدا ہی واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ میں نے جمیل احمد کو بہکایا نہیں ہے۔ شاعری صد فیصد اس کا ذاتی فیصلہ تھا۔ خاندان کی روایت شکنی پر اس کے خاندان کے لوگ سخت ناراض، نالاں اور برہم ہیں۔ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں اور شاعری کی لت چھڑانے کے لئے مجھے اپنے گاؤں بلا رہے تھے۔ وہاں کے حالات کا سامنا کرنے کے تصور سے ہی مجھے لرزہ آ رہا تھا، لیکن میری قسمت میں سونامی سے نبرد آزمائی تحریر ہو چکا تھا۔ اچانک میرے خسر محترم کے انتقال پر ملال کی اندوہناک خبر آئی اور بادل نخواستہ رختِ سفر باندھنا ہی پڑا۔ مجھے وہاں جن کربناک خبر آئی اور بادل نخواستہ رخت سفر باندھنا ہی پڑا۔ مجھے وہاں جن کربناک حالات سے گزرنا تھا۔ اس میں صرف بیگم کا سہارا تھا۔ جو تمام حقائق کی عینی شاہد ہی نہیں بہت حد تک شریک کار بھی تھی۔

چہارم تک تو ہم ہر بلا سے محفوظ رہے، لیکن جس بلائے ناگہانی کے تصور سے ہی دل گھبرا رہا تھا۔ وہ مصیبت کی گھڑی آخر آ ہی گئی۔ ان کے بلاوا پر الامان کا ورد کرتے ہوئے میں دالان میں گیا۔ گول کمرے میں مخصوص افراد کنبہ اپنے چہروں پر سنجیدگی طاری کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ جیسے خاندان میراث یا عزت پر خطرے کے پیش نظر جمع ہوئے ہوں۔ بہر کیف ان کے چہروں پر پھیلے ہوئے کرب کے سائے میں زبردست غم و غصّہ چھپا ہوا تھا۔

حالات کی سنگینی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جمیل کی شاعری رحم مادر میں ہی زائل کر دی جائے گی کیونکہ شاعری کا بھوت اتارنے کے لئے بااثر جوگیوں کی ٹیم اس کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔

خلاف اُمید جمیل احمد مجرم کی طرح سر جھکانے کی بجائے بڑی شان بے نیازی سے ہاتھ میں تازہ اخبار لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور کسی کو منہ کھولنے کا موقع دیئے بغیر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

’’آپ لوگ جس ارادے سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اس پر مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے‘‘ ’’افسوس تو ہم لوگوں کو تمہاری ناگواری حرکت پر ہو رہا ہے‘‘ بڑے بھائی نے بے حد غصّہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ’’ہمارے بزرگوں نے جس فضول اور

واہیات کام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اسے تم بے حیائی سے اپنا کر خاندان کی عزّت کے دامن کو داغدار کر رہے ہو'' پھر دھمکی دیتے ہوئے کہا ''اگر تم اپنی نازیبا اور ناپسندیدہ حرکت سے باز نہ آئے اور ہجروں کی طرح گانے بجانے والی شاعری سے توبہ نہیں کیا تو ہم لوگ تم سے تعلقات قائم رکھنے پر ناپسندیدہ فیصلہ لینے پر مجبور ہوں گے کیونکہ ہمیں خاندان کی عزّت اور شرافت جان سے بڑھ کر عزیز ہے اور ہمیں سماج میں زندہ رہنا ہے''۔

وہ آپ لوگوں کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا پورا حق اور اختیار ہے لیکن میں نے شاعری کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے اور اس کا فوری طور پر کیا فائدہ ہوا ہے اس سے واقفیت کے بعد ہی کوئی فیصلہ اور رائے قائم کیجئے گا تو بہتر ہوگا'' بڑے بھائی کی آتش فشانی اور نامناسب دھمکیوں سے متاثر ہوئے بغیر اس نے جرأت ے ساتھ اپنے خیالات اور جذبات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے بزرگ علاقے کے متمول کسانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ہم آج بھی کسی سے کم نہیں ہیں، لیکن افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ گمنامی ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے۔ ہمارے اسلاف میں کسی نے شہرت کا کام نہیں کیا جس سے خاندان کا نام روشن ہوتا۔ اس کمی اور کوتاہی کا ازالہ اور خاندان کا نام روشن کرنے کے لئے میں نے شاعری کا انتخاب کیا ہے۔ بقول آپ لوگوں کے میری غلط حرکت اور شاعری کا ابتدا ہی میں شاندار کارنامہ دیکھ لیجئے''۔

اپنی وضاحت کی تکمیل کے بعد اس نے اخبار سامنے کرتے ہوئے بلند اور فخریہ انداز میں پڑھنا شروع کیا۔

''مشہور شاعر جمیل احمد جمالی کے پدر بزرگوار اور علاقہ کی مشہور ہستی احمد حسین کا بروز جمعہ کی مبارک ساعت میں انتقال پُر ملال ہوگیا۔ مرحوم دیندار، نیک سیرت اور فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور نادار لڑکیوں کے مددگار اور سہارا تھے۔ وہ دین اور عوام کی خدمت میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات علاقے کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ہزاروں سوگواروں کی دعا ہے کہ خدا انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔''

”کبھی بھی خاندان کے کسی فرد کا نام اخبار میں شائع ہوا تھا؟!“ اس نے محفل پر فخریہ نگاہ ڈالتے ہوئے مسرت اور متکبرانہ انداز میں پوچھا، لیکن اس حیرت انگیز انکشاف پر سب ششدر اور خاموش تھے۔ جس نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ اپنی شاعری کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے بولا۔

مرحوم کی بہترین خوبیوں، اعلیٰ صفات اور خدمات کی تحریری دستاویز اور ہزاروں افراد کی دعاؤں پر خدائے غفور بھی غور فرمائے گا اور کرم کرے گا اور قیامت کے دن اس تحریری ثبوت اور ہزاروں خبر پڑھنے والوں کی شہادت کو فرشتوں کو بھی اسے جھٹلانے میں سوچنا پڑے گا۔ میری شاعری کا یہ ابتدائی کارنامہ اور معمولی سی جھلک ہے۔ میری شہرت اور بڑھے گی تو دوسرے ادباء و شعراء کی طرح ہمارے معمولی سے دُور کے رشتے داروں کی اموات اور آپ لوگوں کے انتقال پر ملال پر بھی اس سے بہترین مضامین شائع ہوا کریں گے اور روزِ محشر اپنی صفائی میں اُس تحریری ثبوت کو پیش کر کے نجات، بخشائش اور انعام و اکرام حاصل کر سکیں گے شاعری صرف میرے لئے باعث عزّت اور شہرت نہیں ہوگی بلکہ خاندان اور دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں کا نام روشن ہوگا اور عاقبت میں بھی کام آئے گی“۔

مستقبل میں جو حشر ہوگا، دنیا دیکھے گی مگر اس قت میں نے دیکھا۔ دھیرے دھیرے سب کے سب خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ شاید ان کو شہرت اور مزے کے بعد نیکیوں کی تحریری دستیاویز کے لالچ نے خاموش کر دیا تھا۔ بہرحال ان کی خاموشی جمیل احمد کے لئے شاعری کی اجازت اور پروانہ تھی۔ اور وہ اپنی شاندار فتح پر اس طرح مجھ سے لپٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے غلطی سے کسی رسالے میں اس کی غزل شائع ہو گئی ہو۔

☆☆

KHOTA SONA

(Mazamin Ka Majmua)

by

MUSHTAQUE RAHI

Edited by

Khalid Hashmi

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-620-2